پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی
کے
ادبی متون

WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

ڈاکٹر ارشد اقبال

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ادبی متون

مصنف

ڈاکٹر ارشد اقبال

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ورثہ فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
WARSA FOUNDATION
INTERNATIONAL

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

PROF. ZIA UR REHMAN SIDDIQUI
KE ADABI MATOON

by

DR. ARSHAD IQBAL

4/F14- Kala Piyada,Sambhali Gate, Moradabad (U,P)
Mobile # : 09412838013

Year of Edition 2021

ISBN 978-93-91238-71-1

₹ 350/-

نام کتاب	:	پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ادبی متون
مصنف	:	ڈاکٹر ارشد اقبال
ایڈیشن	:	۲۰۲۱ء
تعداد	:	۶۰۰
صفحات	:	۳۰۴
قیمت	:	۳۵۰ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.o. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678203, 45678204, 45678286, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

انتساب

قبلۂ دل ونگاہ والدین کے نام

فہرست

پیش لفظ: ڈاکٹر ارشد اقبال ۵

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی: بحیثیت محقق ۶

اسالیب فکر: ایک تجزیہ ۱۹

تحریک آزادی اور اردو نثر: ایک معروضی تجزیہ ۱۰۵

معروضات: ایک تنقیدی جائزہ ۲۱۷

شہیدان جنگ آزادی: ایک تاریخی مطالعہ ۲۵۴

جوشؔ کی تیرہ نظمیں: تنقیدی جائزہ ۲۶۰

اقبال سہیلؔ کا فن: ایک تحقیقی مطالعہ ۲۶۵

اردو کا فاصلاتی نظام تعلیم: تدریس کے آئینہ میں ۲۸۳

جدید اردو ریڈر: اردو رسم الخط کی تدریس ۲۸۹

آسان اردو گرامر: اردو قواعد کی تدریس ۲۹۲

اردو ہندی ڈکشنری: لغت نویسی کا فن ۲۹۴

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اور ترجمہ نگاری ۲۹۷

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تصانیف و تالیف ۳۰۲

ڈاکٹر ارشد اقبال کی تصانیف ۳۰۴

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

پیش لفظ

پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی کی تصنیف ''اردو ادب کی تاریخ'' کا نظری مطالعہ کرنے کے بعد موصوف کی دیگر تصانیف کا مرتکز مطالعہ کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور اسی شوق آفریں جذبہ اور فکر کے سبب ان کی دیگر کتابوں کا متنی تجزیہ کا عمل شروع ہوا جو ''پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی کے ادبی متون'' کی صورت میں حاضر ہے۔

خاکسار نے پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی کے منفرد اسلوب، تنقیدی نظریات اور مخصوص ادبی فکر سے مفصل طور پر بحث کرنے کی سعی کی ہے، جس سے یقیناً طلبہ کی ضرورت و سہولت اور اساتذہ و باذوق قارئین کے لیے ممکنہ تدریسی مواد فراہم ہوسکے۔ تنقید و تحقیق کے حوالے سے متن کا تجزیہ خاکسار کی پہلی ادبی کاوش تصور کی جائے۔

توقع ہے کہ متن کے حوالے سے میری یہ ادبی کاوش اہل نظر اور ارباب بصیرت کے توسط سے ادبی حلقوں میں پزیرائی کا باعث ہوگی۔

ڈاکٹر ارشد اقبال

مرادآباد (یوپی)

۲۵/ اگست ۲۰۲۱ء

WARSA FOUNDATION INTERNATIONAL

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی: بحیثیت محقق

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا شمار برصغیر کے ادبی حلقوں میں ممتاز ناقدین، محقق اور صفِ اوّل کے دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ جدید فکر کے ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم دہلی یونیورسٹی سے مکمل کی، بعدازاں جامعہ ملیہ تشریف لے آئے جہاں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔

دہلی یونیورسٹی میں یو. جی. سی فیلو، پھر انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ کے عہدے پر منتخب ہوکر پوسٹ ڈاکٹورل فیلو رہے۔ بعدازاں وہ یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) نئی دہلی سے منتخب ہوکر اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (حکومت ہند) کے شعبہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ موصوف چند برس سرسید پوسٹ گریجویٹ کالج (اورنگ آباد، مہاراشٹر) میں بحیثیت پرنسپل کے عہدے پر بھی فائز رہے ہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ایسٹرن ریجنل لینگویجز سینٹر بھوبنیشور (حکومت ہند) اور نارتھ ایسٹرن ریجنل لنگویج، سینٹر گوہاٹی (حکومت ہند) میں بحیثیت پرنسپل، خدمات بھی انجام دے چکے ہیں۔

پروفیسر صدیقی کی خدمات کا سلسلہ سیل رواں کی طرح جاری رہا، وہ سینٹر فار پروفیشنل ڈولمنٹ آف اردو ٹیچرز (اردو اکاڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں ڈپٹی ڈائریکٹر بھی رہے اور اِن دنوں شعبہ اردو (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں پروفیسر کے عہدے پر اپنی بیش بہا خدمات انجام

دے رہے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مذکورہ پیشہ وارانہ صلاحیتیں اور خدمات اپنی جگہ لیکن اس میں ایک اہم پہلو یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر اہم ذمہ داریوں کے باوجود ادبی و علمی اور تحقیقی کاموں سے کبھی غافل نہیں رہے، مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اُن کے اعلیٰ سطح کے تحقیقی کام بھی جاری رہے، اور اِس طرح وہ اردو زبان و ادب کی کئی دہائیوں سے خدمت کر رہے ہیں، جسے ہمیشہ زیرک، ارباب بصیرت ادبی حلقوں میں درخورِ اعتنا سمجھا گیا اور ان کی دانش و بینش سے سینکڑوں طلبہ نے بھی استفادہ کیا۔

موصوف کی گراں قدر تحقیقی کاوشوں میں 'اردو ادب کی تاریخ، تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ، اردو ہندی ڈکشنری، ہیونگ سانگ کا سفر ہندوستان، اسالیب فکر، تحریک آزادی اور اردو نثر، شہباز امروہوی فن اور شخصیت اور 'شہیدان جنگ آزادی اہم تصانیف ہیں۔ حالانکہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے نقد بہ نقد تنقید عالیہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، جن میں 'جوش کی تیرہ نظمیں، اسالیبِ فکر، اقبال سہیل کا فن، معروضات' قابل آفریں ہیں۔

ترجمہ نگاری بھی، پروفیسر صدیقی کا محبوب مشغلہ ہے، انہوں نے رسکن بونڈ کی انگریزی کہانیوں کو 'دون کا سبزہ' کے نام سے اردو میں ترجمہ کر کے شائقین ادب کے لیے ایک احسن کام کیا ہے۔

بہر کیف یہاں پروفیسر صدیقی کی اردو زبان و ادب سے متعلق تحقیقی کاوشات کا متنی تجزیہ کرنا مقصود ہے۔ دراصل تحقیق ایک ایسا شعبۂ علم و فن ہے جس میں کچھ بھی حرفِ آخر خیال نہیں کیا جا سکتا، ادبی تحقیق بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اردو کا تحقیقی ادب اس خیال کی نشاندہی کرتا ہے کہ ماضی میں اردو کے آغاز و ارتقا کے کئی نظریے سامنے آئے لیکن نئی تحقیق کی روشنی میں رد کر دیئے گئے اور کچھ عجب نہیں کہ آج کا جامع و مستند نظریہ بھی نئی تحقیقات کی روشنی میں ماند پڑ جائے کیوں کہ کوئی بھی محقق، کسی بھی قسم کے تحقیقی نتائج کو استحکام کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

اُردو ادب کی تاریخ کسی بھی نوع کے ادبی رجحان سے لاتعلق نہیں رہی، جدید ادبی

رویوں میں وجودیت کا مسئلہ ہو یا اشتراکیت کے مباحث ،تاثیریت کی بات ہو یا اظہاریت کا رجحان ،اُردو کے گذشتہ نصف صدی میں اِن تمام رجحانات کے نشانات بآسانی مل جاتے ہیں۔ یہ اُردو ادب کی وہ خصوصیات ہیں جس نے ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے درمیان عالمی اثر پزیری کو ہمیشہ قائم رکھا۔

اُردو زبان و ادب کی تاریخ تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے کو محیط ہے لیکن اپنے تہذیبی وثقافتی جوہر کی وجہ سے اپنی عمر سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اُردو زبان و ادب نے جس طرح اپنے گردونواح کی زبانوں اور ادبیات کو اپنے مخصوص رویوں اور رجحانات سے متاثر کیا، اس سے کہیں زیادہ اردو کے ادبی سرمائے نے عالمی اور مقامی رجحانات ،متوازی اثرات بھی قبول کیے ،کیونکہ ردّ و قبول کے یہ سلسلے مختلف ادبیات کے مابین چلتے رہتے ہیں۔ اردو ادب نے بھی خود کو عالمی ادب کے رویوں سے جدا نہیں رکھا، دنیا کی بڑی زبانوں کے ادب میں مقدم و موخر ہونے کے ساتھ، بعض رجحانات کا یکساں طور پر نفاذ نظر آتا ہے۔

اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی نہایت دلچسپ و مایہ ناز تحقیقی کتاب ’’اردو ادب کی تاریخ‘‘ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یوں تو موصوف مزاجاً ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں لیکن انہوں نے بحیثیت ماہر تعلیم ،مترجم ، ناقد اور ایک کامیاب محقق کی حیثیت سے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

متذکرہ کتاب کی افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے اب تک آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جن سے ہزاروں طلبہ نے استفادہ کیا ہے، کیوں کہ مذکورہ کتاب کے تین وصف ایسے ہیں جو اُسے اِس نوع کی دیگر تحقیقات سے منفرد کرتے ہیں۔

(۱) مجمل انداز۔
(۲) متن میں سہل پسندی۔
(۳) اردو کے ثقافتی اداروں کا تذکرہ، حکائی روایت کے حوالے سے۔

دراصل اردو زبان انسانی شناخت، تشخص اور کردار سازی میں کلیدی کردار ادا کرتی

ہے اگر چہ طلبہ کے لیے مجمل و منفرد زبان و لہجے کا استعمال کیا جائے تو اُن کے لیے موثر ثابت ہوگی، جس سے طلبہ میں تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔اُردو صرف ایک زبان یا لسانی رویوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک شناخت، ایک تہذیب، تمدن، ثقافت، جذبات واحساسات کا خوبصورت امتزاج کا بھی نام ہے اور اگر خیالات و معلومات کا ذخیرہ مجمل اور منفرد ہو تو ترسیل اور ابلاغ کی راہ بھی آسان ہو جاتی ہے، سوچنے اور سمجھنے کا عمل، جو سراسر انسانی ذہن میں تشکیل پاتا ہے، وہ لاشعوری طور پر مجمل و منفرد لہجے میں ہی پراسیس ہو رہا ہوتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''اردو ادب کی تاریخ'' اسی مقصد کے تحت لکھی ہے کہ طلبہ اردو زبان و ادب کی تاریخ سے کماحقہ واقف ہوں اور اس کی درست رفتار کا اندازہ لگا کر مزید لطف اندوز ہو سکیں اور اپنی نصابی ضرورتوں اور سہولتوں کو بھی مدنظر رکھیں۔موصوف نے اردو ادب کی تاریخ کو مجمل و منفرد انداز میں بیان کر کے، طلبہ کو اس بات کے لیے بھی آمادہ کر لیا ہے کہ ان کے لیے زبان اور ادب کی تاریخ سے واقف ہوئے بغیر اپنی اساس کو پہچاننا ممکن نہیں ہوگا۔

کیا کوئی اس نقطۂ نظر سے چشم پوشی کر سکتا ہے کہ سر سیدؒ سے پہلے اردو میں مسجع اور مقفع نثر لکھنے کی روایت تھی، گو کہ میر امّن سہل بیانی کی بنیاد رکھ چکے تھے۔فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفین کی وساطت سے بھی اردو کو عام فہم بنانے کی کوششیں کی گئی تھیں لیکن اب بھی فارسی آمیز اردو کا چلن جاری تھا۔سر سیدؒ نے شعوری طور پر یہ کوشش جاری رکھی تھی کہ اُردو عام فہم ہو اور اس زبان کی شاعری عشق و عاشقی اور گل و رخسار کے دائرے سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں داخل ہو جائے اور نثر میں بھی داستان کی فسوں گری سے نجات حاصل ہو۔سائنسی اور اہم موضوعات پر مضامین لکھے جائیں، اس کی ابتدا خود سر سیدؒ نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھ کر کی، ان کی تحریک پر نہ صرف ان کے رفقا بلکہ دوسرے حلقوں کے مصنفین نے بھی اردو زبان و ادب کو مختلف النوع موضوعات سے آراستہ کرنے کی مہم شروع کر دی اور یوں اردو شاعری اور اردو نثر کی دنیا میں سہل پسندی کو فروغ حاصل ہوا۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ''، سر سیدؒ کی سہل پسندی اور اردو کو عام فہم بنانے کی مہم میں ایک بہت اہم

اضافہ ہے اور سرسیدؒ کے لسانی مشن کی اِن کوششوں میں پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی سرسیدؒ کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔موصوف کتاب کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> اُردو ادب کی تاریخ پر یہ کتاب طلبہ کی نصابی ضرورتوں اور سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کی گئی ہے۔اِس لیے اس کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، جس سے طلبہ اردو زبان و ادب کے بارے میں آسانی سے سمجھ سکیں (ص۱۱)

اردو کی ترویج و اشاعت میں سماجی وثقافتی اداروں کی بڑی اہمیت ہے، حالانکہ زبان و ادب کے مورّخین نے اس موضوع کو کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا جبکہ اردو زبان کے فروغ میں سماجی و ثقافتی اداروں کا بڑا رول رہا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اردو کے سماجی وثقافتی اداروں یا اردو کے حکائی ادب سے کیا مراد ہے؟'حکایت' عربی کا لفظ ہے، اس کے معنی قصہ، کہانی ہے، اس کی جمع حکایات ہے۔دراصل انسانی فطرت میں میل جول اور تمدنی زندگی گزارنے کا مادہ بھرپور پایا جاتا ہے۔انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے تال میل بنا کر رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔اپنی بیتی سناتا ہے اور دوسرے کی بیتی خود سن کر اپنی فطرت میں سکون واطمینان محسوس کرتا ہے۔جب کسی تیسرے کا تذکرہ آپس میں کیا جاتا ہے تو وہ حکایات کا روپ اختیار کر لیتا ہے حکایت کی اہمیت و افادیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب اِسے تحریری شکل دے دی جائے، اگرچہ اِس میں بڑھا چڑھا کر اور مافوق الفطرت عناصر کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ داستان گوئی کے زمرے چلی جاتی ہے اگر چہ حکایت میں سلیقہ مندی، ہر دلعزیزی اور زبان و بیان کی عمدگی ہو تو اس کو''حکائی ادب''میں شمار کیا جائے گا۔

لہٰذا پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اردو کے سماجی وثقافتی اداروں (حکائی ادب) کی اہمیت کو سمجھا اور اپنی کتاب''اردو ادب کی تاریخ''میں باقاعدہ ایک باب قائم کیا، جس میں مشاعرہ قوالی، چہار بیت، مرثیہ خوانی، مجرے، غزل گائیکی نثر میں داستان گوئی، قصے کہانیاں قابل

ذکر ہیں۔ان اصناف کے آغاز وارتقا،محرکات، اجزائے ترکیبی اوران کے سیاق وسباق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔وہ اس باب میں لکھتے ہیں:

> اُردو کی حکائی روایت بہت پرانی ہے۔تین چار سو برسوں سے اس روایت نے ارتقاء کے مدارج طے کرتے ہوئے کئی سماجی و تہذیبی اداروں یا اصناف کو جنم دیا اوران کے اجزائے ترکیبی بھی مرتب کیے ان سماجی وتہذیبی اصناف میں مشاعرہ ،قوالی چار بیت،مرثیہ نگاری، مجرے،غزل گائیکی اورنثر میں داستان گوئی، قصے کہانیاں اور ذکر کا فن خصوصاً قابل ذکر ہیں۔
>
> (ص ۵۴)

اس حوالے میں سماجی وتہذیبی اصناف کا ترتیب وار تجزیہ کرنا مقصود ہے،جس سے مذکورہ کتاب کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکے۔اس روایت میں مشاعروں کی بڑی اہمیت ہے۔مشاعروں نے اردو کو عوام تک پہنچانے اور مقبول عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔کسی بھی زبان کی ترقی وترویج کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ زبان کثرت سے بولی اور سمجھی جائے اردو زبان کو اِس مقام تک لانے میں کئی سماجی اداروں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اِن میں خانقاہوں درباروں اور بازاروں کے علاوہ مشاعروں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔مشاعروں سے عام طور پر شعری نشستوں اورادبی محفلوں کا تصورا بھرتا ہے، جو کسی حد تک درست بھی ہے لیکن مشاعرہ محض یہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی تہذیبی ومعاشرتی سیاق وسباق کے حامل ہیں مشاعرہ اردو کی حکائی روایتوں میں سے ایک معروف سماجی ادارہ ہے،جس نے نہ صرف تہذیبی اور ثقافتی روابط واختلاط کو مستحکم کیا بلکہ لوگوں کے مابین رشتوں کو مضبوط بنانے کا تصور پیش بھی کیا،مشاعروں کی ابتدا کا یہ وہ زمانہ ہے جب عوامی سطح پر تفریحاً وقت گزاری کا کوئی ذریعہ نہیں تھا،ایسے میں مشاعروں نے ، جہاں عوام کے لیے ایسے مواقع فراہم کیے، وہیں زبان وادب کے دائروں کو بھی وسیع تر کیا اس طرح شعروسخن کی محفلوں نے ادب اور عوام کے درمیان گزرگاہ تعمیر کی

اور یوں ادب کا رشتہ سماج سے ہم آہنگ ہونا شروع ہوا مشاعروں سے عوام کی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ شعر وسخن کی یہ محفلیں نہ صرف ذہنی تفریح وتفنن طبع کا ذریعہ تھیں بلکہ ان میں عوامی جذبات کی نمائندگی بھی ہوتی تھی، کیوں کہ اصناف ادب میں شاعری دلکشی اور فسوں آفرینی کی حامل ہے۔ عالم ادب میں اردو یا فارسی کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے کہ لوگ شعرا کے کلام کو مجمع میں بڑے طمطراق اور دل جمعی سے سنتے ہیں گو کہ اس روایت کی ابتدا عربی سے ہوئی تھی لیکن مقبولیت اور چلن کے اعتبار سے یہ روایت اردو میں زیادہ مستحکم ہوئی پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس ضمن میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> مشاعروں سے مراد شاعروں اور سامعین کا وہ مجمع ہے، جس میں ایک وقت اور مقام پر شعراء اپنا اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور داد سخن حاصل کرتے ہیں۔ اردو میں مشاعروں کی روایت بہت پرانی ہے ان کی ابتداء سولہویں صدی سے ملنے لگتی ہے جو مغلوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ دہلی، لکھنو، حیدرآباد، بھوپال، رام پور، امرہہ، احمد آباد، آگرہ اور لاہور وغیرہ اس کے خاص مراکز ہیں۔ (ص ۵۵)

حکائی ادب میں قوالی کا تذکرہ بھی آتا ہے جو قول سے مشتق ہے۔ یہ برصغیر میں گائی جانے والی ایک خاص صنف ہے، اس گایکی کا سٹائل قدر مختلف ہے، جس میں نعت، حمد وثنا، صحابہ کی توصیف اور منقبت بیان کی جاتی ہے۔ قدما کی روایتوں، صوفیا کے تذکروں اور تاریخی کتابوں کے مطابق اس خطے کی خانقاہوں میں قوالی کا رواج رہا ہے۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اردو کی ترویج واشاعت میں، اولیا کرام نے بھرپور حصہ لیا، جو عوام کو روزمرہ کی مقامی زبان میں دین و اخلاق کی تعلیم دیتے تھے اسلام کی تبلیغ میں صوفیہ نے مقامی لوگوں کو اپنی دلنشیں گفتگو سے متاثر کیا ان بزرگوں کی سادہ زندگی پر اخلاص، نصیحت، عمل اور اعلیٰ کردار کی بدولت عوام ان کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر صدیقی اس طرح رقم طراز ہوئے ہیں:

> امیر خسرؔو قوالی کے موجد ہیں، انہوں نے اس ادارے کو ایک فن بنادیا ہے۔قوالی میں غزل گائی جاتی ہے ۔اس لیے غزل کا انتخاب کرتے وقت بہت سی چیزوں کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے کہ غزل کا مفہوم حاضرین محفل کے مزاج، وقت اور حالات سے مناسبت رکھنا چاہیئے اور اس کے راگ کا انتخاب موقع محل کے مطابق ہونا چاہیئے ۔اردو سماج میں قوالی کا رواج عام تھا چشتی سلسلے کے صوفیا قوالی کو روحانی غذا تصور کرتے تھے اور قوالوں کی سرپرستی کرتے وقت رفتہ رفتہ عوام میں اس کا ذوق سرایت کر گیا، مشاعر، مرثیہ خوانی کی طرح قوالی نے بھی اردو شاعری کی ترویج واشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیے (ص ۵۶)

سماجی وتہذیبی اداروں میں مرثیہ خوانی کی کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے، جتنی عالمی ادب کی اُن تخلیقات کی ہے جن میں مذہبی عقائد کا اظہار کیا جاتا ہے ،یعنی واقعات کی انسانی و اخلاقی ،زبان و بیان کی سحر انگیزی، اظہار واسلوب کی دل پذیری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری ،اسی لیے مرثیہ کو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔اس میں جو وسعت ،تنوع اور شعری بیانیہ ہے، وہ اردو کی کسی دوسری صنف میں موجود نہیں ہے ۔مرثیہ تہذیب و معاشرت، تاریخ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا بہترین نمونہ ہوتی ہے۔اس ادارے کے حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> مرثیہ خوانی میں سانحہ کربلا کو تازہ کیا جاتا ہے۔اس میں آواز ،لہجہ ادائے الفاظ، عضو جسم کی جنبش وغیرہ کا اپنا کردار ہوتا ہے اردو میں مرثیہ خوانی باقاعدہ فن ہے جسے اردو میں فروغ ملا محرم کے مہینے میں خصوصاً شروع کے دنوں اور چہلم تک مسلمانوں کے گلی کوچوں میں اس فن کے مظاہرے ہوتے ہیں مرثیہ خواں خود کو

مجمع کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ خود بھی جذبات و
کیفیت سے دوچار ہو رہا ہو جو نفس مضمون میں ہے۔''

(ص۵۶)

پروفیسر صدیقی کی ژرف نگاہ نے اردو کے سماجی وثقافتی اداروں کی فہرست میں مجرے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مجرا عورتوں کے رقص کی ایک تفنن صورت ہے جو جنوبی ایشیا میں مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں ،نوابوں اور جو اشراف بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ ہوتے تھے؛ اُن کی تفریح طبع کے لیے رات کے وقت پیش کیا جاتا تھا۔ مجرے کا رجحان عہد مغلیہ کے زوال پزیر دور میں تیزی سے فروغ پایا، جس میں مقامی کلاسیکی کتھک ڈانس کے عناصر کو مقامی موسیقی بشمول ٹھمری اور غزل کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ مذکورہ ادارے کے حوالے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

ہندوستانی تہذیب میں نرتیہ کی تاریخ بہت پرانی ہے دیوی دیوتاؤں کے سامنے اپسرائیں رقص کرتی تھیں، ناچنے والی عورتیں مندروں سے وابستہ تھیں عربوں میں کنیزیں اور نچلے طبقے کی عورتیں ناچنے گانے کا کام کرتی تھیں۔ ایرانیوں کے یہاں بھی رقص وسرور کا سراغ ملتا ہے۔ یہ عورتیں مزاروں پر بھی سلام کرنے حاضر ہوتی تھیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ رقص کرتے وقت عورتیں گیتوں اور دوہوں کے علاوہ غزلیں گاتی تھیں تو عوام ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے ان طوائفوں کے ذریعے اردو شاعری لوگوں کے زبان زد ہوئی اور اس طرح اردو زبان کی ترویج واشاعت بھی ہوئی۔ (ص۵۷)

اسی طرح اردو کے سماجی وثقافتی اداروں میں چہار بیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ چہار بیت چار صدیوں پرانا پرفارمنگ فن (Art) ہے۔ اِسے فنکاروں کا ایک گروہ پیش کرتا ہے جس

میں گانے والے اور دف بجانے والے فنکار شامل ہوتے ہیں چہار بیت یعنی چار مصرعوں والے بند کی طویل کڑی نظم کو کہتے ہیں جس کو فنکار مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بقول پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی:

چار بیت کی ایجاد کا سہرا افغانستان کے سرحدی پٹھانوں کے سر جاتا ہے پشتوں میں چار بیت کا آغاز اردو سے پہلے ہوا لیکن زمانہ عروج وہی ہے جو اردو کا ہے۔ چار بیت کو پٹھانوں کا لوک گیت بھی کا جاتا ہے۔ اسے پٹھان راگ بھی کہتے ہیں، یہاں استاد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ فی البدیہہ شعر کہہ سکے اگلی صف میں خلیفہ اور دائیں بائیں دو ایسے ہم نوا ہوتے ہیں جن کی آواز خلیفہ کی طرح اونچی اور حافظہ تیز ہو، باقی لوگ دوسری اور تیسری صفوں میں بیٹھ جاتے ہیں تیسری صف والے کھڑے رہتے ہیں۔ دف نوازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سارے ہم نوا کسی ایک تال پر دف بجاتے ہیں، چار بیت پٹھانوں کی بستیوں میں کافی مشہور ہے، جیسے بھوپال ٹونک رام پور، بریلی، امروہہ، قائم گنج احمد آباد وغیرہ چار بیت میں غزلوں کے ذریعے رچی ہوئی معیاری زبان استعمال ہوتی ہے جو عوام تک پہنچتی ہے۔''

(ص ۵۷)

حکائی ادب کے اسی ڈومین (Domain) میں داستان گوئی بھی ایک آرٹ ہے، اس فن کا تعلق تیرہویں صدی سے تصور کیا جاتا ہے۔ داستان گوئی کو نثری افسانوی ادب بھی کہہ سکتے ہیں اس میں کہانی کو ممکن حد تک طول دیا جاتا ہے قصے در قصے بیان کیے جاتے ہیں، کیونکہ ان قصوں کی اساس خیالا آرائی اور مافوق الفطرت عناصر پر مبنی ہوتی ہے۔ یعنی داستان اساطیری اور تخیلاتی کہانیوں کے مجموعے کا نام ہے پروفیسر صدیقی فرماتے ہیں:

داستان گوئی اردو کی حکائی روایت میں بے حد اہم مقام رکھتی ہے اردو میں یہ روایت عربی و فارسی کے اثر سے آئی۔اردو کے مستند داستان گو میر باقر علی اپنے وقت کے نامور داستان گو تھے۔جب قصہ گوئی بڑھی اور دربار سے نکل کر بوڑھی نانیوں اور دادیوں کے ذریعے باہر آئی تو عوام پسند ہوگئی داستان گوئی ایک زبانی عمل ہے جو ترسیلی تکلمی زبان میں ہوتی ہے۔اردو کی ترویج و اشاعت میں اس روایت نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔جب کوئی زبان ادبی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کا رشتہ حکائی روایت سے ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ حکائی روایت لوک ادب کا حصہ ہوتی ہے لیکن اردو واحد زبان ہے، جو ادب کے ساتھ ساتھ لوک ادب کی اس روایت کو بھی ساتھ لیکر چلتی ہے اسی عمل نے اردو زبان و ادب کو پروان چڑھایا اور ہر دلعزیز بنایا۔''(ص۵۸)

پروفیسر توقیر احمد خاں (سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے اپنی کتاب ''تبصرے''میں، مذکورہ کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''یوں تو مورّخوں نے تاریخ ادب اردو میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہے لیکن پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ''اردو ادب کی تاریخ'' یک گونہ ممتاز اور جداگانہ ہے۔اس کتاب کا سب سے اہم وصف اس کا اختصار ہے اور اردو کے ثقافتی اداروں کا تذکرہ ہے جسے تاریخ دانوں نے عموماً اکثر نظر انداز کردیا ہے سات آٹھ صدیوں پر پھیلی اردو کی ارتقائی تاریخ کو قلم بند کرنا آسان کام نہیں ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن کی کتاب کو دیکھ کر

محسوس ہوا کہ قلم کا ایجاز ہی، اس کا اعجاز ہے۔''

(تبصرے رص ۲۹۲)

بحیثیت مجموعی یہ کتاب بالترتیب سات ابواب میں منقسم ہے ۔ پہلا باب اردو زبان کے ارتقا سے متعلق ہے جس میں اردو کا ہند آریائی زبانوں سے رشتہ، جدید آریائی زبانوں سے اردو کا انسلاک اور اردو زبان پر عربی وفارسی کے اثرات پر انتہائی عالمانہ اور سہل انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا باب دکن میں اردو سے تعلق رکھتا ہے، جس میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کے ادوار میں دکنی اردو اور دکن میں تخلیق ہوئے فن پاروں سے واقفیت کرائی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا باب 'شمالی ہند میں اردو' پر مشتمل ہے، جس میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی لسانی وادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے اردو کے ادبی اداروں یعنی دہلی کالج، فورٹ ولیم کالج، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کا بھی تعارف ہے۔ مزید براں اردو کے سماجی وتہذیبی اداروں، ادبی رجحانات وتحریکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے طلبہ ادبی تحریکوں مثلاً سرسید تحریک، ترقی پسند تحریک، رومانوی تحریک اور جدیدیت کے رجحانات سے کماحقہ واقف ہو سکیں۔

موصوف نے مذکورہ کتاب کا ایک باب اردو کی شعری اصناف پر قائم کیا ہے، جس میں غزل، نظم قصیدہ، مثنوی مرثیہ، قطعہ اور رباعی کا نہ صرف یہ کہ تعارف تحریر کیا ہے بلکہ ان اصناف کی تعریف، تاریخ، اہم شعرا اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں باب ہفتم نثری اصناف کے لیے وقف ہے، جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے میں افسانوی ادب کا تعارف ہے، جبکہ دوسرا حصہ غیر افسانوی نثر سے متعلق ہے اس باب کی قرأت سے داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ جیسی معروف اصناف کی تعریف، تاریخ، اہم فنکاروں کا تعارف اور ان کے فن پاروں سے متعلق بہ نظر غائر مطالعہ پیش کیا ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصے میں سوانح نگاری، مضمون نویسی، خطوط نگاری، انشائیہ نگاری اور خاکہ نویسی پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور یہی باب طلبہ کو ادبی تنقید سے بھی روشناس کراتا ہے۔

کتاب کا آخری حصہ ماس میڈیا کا احاطہ کرتا ہے۔اس باب میں عوامی ذرائع ابلاغ کا تعارف ملتا ہے،اس حوالے میں پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات ورسائل،الیکٹرونک میڈ کے ذیل میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اُن کی قسمیں اوران کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے،ساتھ ہی ترجمے کے فن پر بھی مدلل گفتگو کی گئی ہے کتاب کا تمام وکمال مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر توقیر احمد خاں لکھتے ہیں:

> اس مختصر سی کتاب میں انہوں نے اردو زبان وادب کی تاریخ کو سمو دیا ہے۔ پروفیسر صدیقی کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات سے بھی بے خبر نہیں رہے ۔انہوں نے عوامی ذرائع ابلاغ ترجمہ نگاری وغیرہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے ۔یوں سمجھو کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔'' (تبصرے)

ایک سو بیانوے صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنے مجموعی حجم میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، یہی سبب ہے کہ کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں نے مذکورہ کتاب کی افادیت کو مدنظر رکھ کر طلبہ کی ضرورتوں اور سہولتوں کے پیش نظر اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔

❀❀

اسالیبِ فکر: ایک تجزیہ
آثارالصنادید: آثاریات پر ایک نادر دستاویز

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی برصغیر کے معروف دانشور، فعال اور متحرک اُستاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔اُنھوں نے ہمیشہ تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے دیگر فروغ اردو کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

موصوف کا شمار برصغیر کے اُن ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے،جنھوں نے درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہتے ہوئے بحیثیت ایک کامیاب قلم کار و ادیب کے بھی مستحکم کی ،ان کا مختلف موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی کام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر صدیقی کا خصوصی میدان تحقیق وتنقید ہے لیکن انہیں غیر افسانوی ادب سے بھی دلچسپی ہے، جس میں اُنھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔حالانکہ اردو ادب میں شعری اور نثری اصناف پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔نثری ادب اور خاص طور پر غیر افسانوی ادب پر لکھی گئی کتابیں بہت کم اِس مقام کو پہنچتی ہیں جنھیں قبول عام کی سند حاصل ہوئی ہو۔اس ضمن میں پروفیسر صدیقی کی کتاب ''اسالیب فکر'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

''اسالیبِ فکر'' پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی اُن تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا انتخاب ہے جو مختلف موقعوں پر پیش کرنے کے لیے لکھے گئے تھے۔ان میں بعض ریڈیائی تقریریں،مختلف سیمیناروں

کے لیے لکھے گئے مقالات اور توسیعی خطبات شامل ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ''آثارِ صنادید: آثاریات پر ایک نادر دستاویز، علاوہ ازیں اقبالؔ اور تصوف غالبؔ کی حکیمانہ دانش اور فہم و فراست، پریم چند کی کہانیوں میں سماجی شعور، فیضؔ کے نثری افکار، جوشؔ کا فن، جوشؔ کی نظموں میں رومانیت، قائم شناسی: ایک تجزیہ، شادؔ عظیم آبادی: شخصیت اور سوانح، قاضی عبدالغفار، اقبال سہیل کا فن، اوپیرا نگاری، اردو شاعری میں پیکر تراشی، ہندوستانی زبانوں کا مرکزی ادارہ، ہماچل میں اردو: اجمالی جائزہ، تحریک آزادی اور اردو صحافت'' مضامین شامل ہیں۔ ان سبھی مضامین پر گفتگو سے قبل راقم اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اس کی مقبولیت کے حوالے سے چند سطور لکھنا ضروری سمجھتا ہے کیونکہ اس کا تعلق پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے وقیع پیش لفظ سے ہے، جس میں موصوف نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا، تعمیر و ترقی ترویج و اشاعت، ہر مذہب و ملت کے ادبا اور شعرا کے حوالے سے عالمانہ گفتگو کی ہے۔

دراصل انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سی زبانیں وجود میں آئیں جن میں بیشتر ایک خاص مدت، کسی جغرافیائی خطہ میں بولی گئیں لیکن آہستہ آہستہ ان کی شکل و صورت بدلتی رہی اور مرورِ ایام کے ساتھ ہی وہ زبانیں نقوشِ پارینہ ہوگئیں، ان کی جگہ دوسری زبانوں نے لے لی، چند زبانیں ایسی بھی ہیں جو اپنی خصوصیت کی وجہ سے زندہ و جاوید ہوگئیں۔

اردو بھی ایک ایسی ہی زبان ہے جس کی تاریخ تقریباً سات سو برس کو محیط ہے اور اسے کبھی گجری کہا گیا تو کبھی دکنی کے نام سے جانی گئی، کبھی ہندوستانی اور کبھی ریختہ، شاہجہاں کے دورِ حکومت میں اردوئے معلّیٰ کا خوبصورت نام ملا، بعد ازاں مستقل طور پر اُردو رائج ہوگیا۔

اُردو زبان کو محض وحدت کی زبان سمجھنا، اس کے ساتھ سراسر بے انصافی ہوگی کیونکہ وحدت تو تقریباً ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً مراٹھی مراٹھیوں کو جوڑتی ہے، گجراتی گجراتیوں کو کشمیری کشمیریوں کو، بنگالی، بنگالیوں کو زبان کی بنیاد پر جوڑتی ہے لیکن اردو کو وحدت کی زبان نہیں کہہ سکتے بلکہ اردو کو تہذیبی اختلاط، میل جول، محبت، قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کی زبان کہنا زیادہ بہتر ہے مختلف خصوصیات کی حامل یہ وہ اردو زبان ہے جو نہ جغرافیائی تقسیم کو تسلیم کرتی ہے اور

نہ مذہبی یا لسانی عداوت رکھتی ہے بلکہ سب کے ساتھ مل کر شیر و شکر ہو جاتی ہے۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> ہندی، اردو اور پنجابی، ہندوستان کی تین بڑی زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ہندی، عربی زبان کا لفظ ہے جبکہ پنجابی فارسی اور اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اردو ایک Pan Language ہے۔اس زبان کا رسم الخط Perso arabic ہے۔اردو کے لکھنے پڑھنے، بولنے اور سمجھنے والے ہر مذہب و ملت کے افراد ملک کے ہر خطے میں موجود ہیں۔اس طرح یہ زبان ملک گیر سطح پر اپنا ایک قومی کردار یعنی National Character رکھتی ہے اور پورے ملک میں لسانی یکجہتی اور عوام میں مقبولیت کی وجہ سے قومی یکجہتی (Natioanal Integration) کی علامت بن گئی ہے۔(ص۱۰)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اردو زبان نہ جغرافیائی تقسیم کو تسلیم کرتی ہے، نہ کسی مذہبی مخاصمات کو پناہ دیتی ہے، نہ اس کے دامن میں لسانی خصومت کی تلخی ہے۔اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے کتاب کے پیش لفظ میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> ہر مذہب و ملت اور ادبیات کا علمی، ادبی اور مذہبی سرمایہ اِس زبان نے اپنے دامن میں سمولیا ہے، گیتا، رامائن، مہابھارت گروگرنتھ صاحب نیز دیگر مذہبوں کی کتابوں کے تقریباً سات سو تراجم اردو میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔اردو اپنی شیرینی، لطافت اور لہجہ کی مٹھاس کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول ہو چکی ہے۔اِس زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھنے اور اس کے لہجے پر مہارت حاصل کر لینے کے بعد دنیا کی

کسی بھی زبان کا تلفظ ادا کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی ،اس لیے یہ زبان عام آدمی کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ سائنٹفک زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔اردو کا نہ صرف ہندوستانی زبانوں سے گہرا لسانی رشتہ ہے بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں سے بھی اِس کا باہمی لسانی تعلق ہے ۔اِس لیے اردو ہند آریائی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہند یورپی زبان (Indo European Language) بھی ہے اِس ضمن میں یوروپین مصنفین گارساں ،دتاسی، اشپرنگراور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی خدمات کوفراموش نہیں کیا جاسکتا۔(ص ۱۱)

اردو انشا پردازی کا جو انداز ہے،اُس کے موجد سرسید ہیں۔سرسید احمد خاں اُردو کے بانی نہ سہی البتہ جدید اردو نثر کے بانی ضرور ہیں،انہوں نے اردو رسم الخط کا تحفظ بھی کیا،اس سے قبل کی نثر میں فارسی زبان کی زیادہ آمیزش پائی جاتی ہے۔کسی نے فارسی تراکیب سے نثر کومزین کرنے کی کوشش کی اور کسی نے قافیہ بندی کے زور پر نثر کوشاعری سے قریب تر لانے کی جدوجہد کی ،ان کوششوں کے نتیجے میں اردو نثر تکلف اور تصنع کا شکار ہوکر رہ گئی تھی۔

سرسید ایک ایسے ادیب ہیں جنہوں نے اُردو نثر کی خوبصورتی پر توجہ دینے کے بجائے اُس کی تسہیل پر زور دیا،ان کی نثر نویسی کا مطلب ومقصد اپنی علمیت کا رعب قائم کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے خیالات ونظریات کوعوام تک پہنچانا مقصود تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ،نہایت آسان نثر میں لکھا تا کہ اُسے عوام بہ آسانی سمجھ سکیں۔آثار الصنادید کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس نکتہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

سرسید احمد خاں کو زبان کی اصلاح سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔دراصل وہ آسان اور عام فہم زبان میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے میں دلچسپی رکھتے تھے ۔اگر سرسید کے

ذہن کے کسی گوشہ میں ''اصلاح زبان'' کا تصور ہوتا تو وہ
آثارالصنادید کے پہلے ایڈیشن میں مقفع مسجع ثقیل اور اَدق
زبان کا استعمال نہ کرتے۔(ص۲۱)

پروفیسر صدیقی، سرسید احمد خاں کو ایک ایسا ادیب تصور کرتے ہیں جو اپنے خیالات کو لاشعوری طور پر یا بغیر کسی حکمت عملی کے لکھنا شروع کردے۔اس حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

سرسید ایک ذہین آدمی تھے اور محنت شاقہ میں یقین رکھتے تھے
اس نوع کا انسان بغیر کسی سوچ سمجھ کے کام شروع کردیتا ہے
سرسید نے بھی بغیر سوچے سمجھے آثارالصنادید کو ترتیب
دینا شروع کردیا، کس طرح کی نثر ہوگی؟ اس کا لائحہ عمل کیا
ہوگا؟ اور یہ کام کس طرح پایہ تکمیل کو پہنچے گا؟ یہ سب سوالات
کتاب کی ترتیب سے قبل سرسید کے ذہن میں نہیں تھے، البتہ
یہ کہا جاسکتا ہے کہ آثارالصنادسرسید کی پہلی کاوش تھی۔اس بنیاد
پر بعض خامیوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔(ص۲۳)

موصوف نے مجموعی حیثیت سے آثاریات پر آثارالصنادید کو سرسید کی نادر تصنیف بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل اور خصوصاً دہلی کی تہذیبی، علمی، ثقافتی اور تاریخی منظرنامے کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

❀❀

اقبالؔ اور تصوف

''پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اسالیب فکر'' میں دوسرا مقالہ ''اقبالؔ اور تصوف'' شامل کیا ہے یعنی اقبالؔ کے نظریۂ تصور کی وضاحت کی کوشش کی ہے۔موصوف نے اس مقالہ میں اقبالؔ کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے مکالمہ قائم کیا ہے تصورِ اقبالؔ کی تائید میں وہ لکھتے ہیں:

> اقبالؔ کے یہاں تصوّف کے دو پہلو بہت اہم ہیں ...عملی اور اخلاقی عملی پہلو کے تحت شریعت کے احکام کی پابندی اور پوری طرح اُس پر عمل پیرا ہونا۔اخلاقی پہلو کے ضمن میں انسانوں سے محبت اور حسن سلوک ، کیونکہ شریعت کے رہتے ہوئے تصوّف کی کوئی گنجائش نہیں اقبالؔ کے نزدیک تصوّف اسلام سے ایک فرار ہے۔اُن کے یہاں تصوّف کا عملی پہلو ہی قابل قبول ہے۔(ص۲۵)

اقبالؔ شاعر ہونے کے ساتھ عظیم مفکر، دانشور، فلسفی اور محقق تھے۔ان کا تعلق کسی خاص مذہبی مسلک سے نہیں تھا، وہ نہ کبھی فرقہ واریت کے مرض میں مبتلا ہوئے۔اقبالؔ صرف تابع شریعت تھے اور سنجیدہ معنوں میں اسلام کے نفاذ کے علمبردار۔اگر اقبالؔ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، اُن کی ذات، ذہنی اِرتقا کے عمل سے گزری تھی کیونکہ اُن کے خیالات،

اُن کی تحقیق اور غور و فکر کے ساتھ بدلتے رہے تھے۔

اقبالؔ کا موروثی مسلک وحدت الوجود تھا۔ان کے آباؤاجداد اِسی سلسلے کے ماننے والے تھے۔ابتدا میں اقبالؔ بھی تصوّف کے اِسی مسلک کو تسلیم کرتے تھے۔انہوں نے شروع میں مولانا روم کو بھی، جو ان کے روحانی استاد اور مرشد ہیں؛ وجودی تصوّف کا قائل سمجھا لیکن بعد میں اُن کے بارے میں اقبالؔ کی رائے بدل گئی۔اقبالؔ وحدت الوجود کو اسلام کے خلاف سمجھتے تھے بلکہ اِس مسلک کو اسلام کی ضد قرار دیتے تھے۔وہ ان صوفیوں کے سخت خلاف تھے جو لوگوں میں تارک دنیا ہونے کو خدا کی ذات میں فنا کی راہ بتاتے تھے۔اقبالؔ کو بے عملی سے شدید اختلاف تھا، اِسی لیے وہ اِسے اسلام کی ضد قرار دیتے تھے کیونکہ اقبالؔ اپنے موقف میں انسان کی انفرادی حیثیت کے مکمل معترف نظر آتے ہیں۔ان کی رائے میں اسلام، رہبانیت کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔اس ضمن میں پروفیسر صدیقی اپنا نقطۂ نظر اِس طرح بیان کرتے ہیں:

> اقبالؔ کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ کم نظر صوفیہ نے تصوّف کے اعلیٰ اقدار کو جس طرح پامال کیا، وہ بہت اندوہناک ہے مراقبہ اور سرور بھی فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔فطرت کے مطالبات سے منہ موڑنا صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال اور سکر کی لذّت میں نقدِ حیات کو گنوا دینا اقبالؔ کو ہرگز گوارا نہیں تھا۔''
>
> (ص۲۹)

اقبالؔ کے مطابق وجودیت نے انسان کی خودی کو عنقا کیا ہے جس سے انسان کی بے عمل ہو گیا تھا اِس لیے اقبالؔ نے ایک متحرک انسان کے خیالات کی تشہیر کی، کیونکہ اُن کے نزدیک مسلمانوں کی خستہ حالی اور ترک عمل کی اہم وجہ وحدت الوجود ہے، جبکہ وجودی مسلک کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ ہر چیز میں جاری وساری ہے لیکن اقبالؔ اس کے برعکس تھے کہ اللہ اِس کائنات کا خالق و مالک ہے اور جب تک چاہے گا اِس کائنات کو آباد رکھے گا، پھر فنا کردے گا یعنی اقبالؔ کے یہاں مسلمانوں کے لیے اللہ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ خانہ نشینی، رہبانیت، تارک دنیا یا

حالت سکرات نہیں ہے بلکہ اقبالؔ کا مردِ مومن ایک طاقتور شخصیت ہے ۔اقبالؔ نے اِسی طاقتور شخصیت اور مردِ مومن کو شاہین کہا ہے۔اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے نہایت عالمانہ گفتگو کی ہے:

> اقبالؔ کو تصوّف کا عملی اور اخلاقی پہلو قابل قبول رہا باقی تصوف کا مابعد الطبیعیاتی فکر و فلسفہ، وحدت الوجود،عقیدہ اور اس کی تمام تر فلسفیانہ موشگافیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں،اگر یوں کہا جائے کہ اقبالؔ کے فکری نظام میں تصوّف کے جو عناصر کارفرما نظر آتے ہیں،اُس کا تعلق اُس اصول پر ہے جس کی ابتدا نبی کریمؐ کی حیات طیبہ کی مقدس اور مطہر معمولات پر ہیں اور جس کی توسیع اور تسلسل کا سراغ حضرت علیؓ کے دل کی تونگری اور روحانی فتوحات میں نظر آتا ہے۔شاعر مشرق اس تصوّف کے علمبردار رہے جس کے ڈانڈے عشق عمل، خودی،فقر اور استغنا سے باہم پیوستہ ہوں۔وہ اس عجمی تصوف کے سخت مخالف رہے جس سے انسان کے اندر بے عملی،عزلت نشیبی، دنیا سے علاحدگی و بے نیازی ،رہبانیت اور کارگہہ حیات سے انحراف کا احساس پیدا ہو۔(ص۳۳)

پروفیسر صدیقی اِس نکتہ کو بھی زیر بحث لائے ہیں جس میں اقبالؔ تمام مسائل کا حل قرآن مجید میں تلاش کرتے ہیں۔اقبالؔ نے جو بھی فلسفے پیش کیے یا علائم وتراکیب اُن کے کلام میں ملتے ہیں،اُن سب کے مآخذ قرآن مجید ہے،یا تو بذات خود وہ قرآن کا ترجمہ یا تشریح ہیں یا قرآن نے جو خصوصیات بیان کی ہیں،اُن پر صد فیصد کھرے اُترتے ہیں۔دنیا میں سرخروئی اور سربلندی کا راز قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے اور اُسے اپنانے میں مضمر ہے اور ذلت وخواری کی بھی بنیادی وجہ قرآن سے دوری ہے۔اقبالؔ نے اِسی دعوتِ فکر کو اپنے کلام کے ذریعے عام کیا۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> اقبالؔ کے یہاں قرآنی آیات اور احادیث کا براہ راست یا بالواسطہ اثر واضح طور پر نظر آتا ہے کیونکہ اقبالؔ نے قرآن حکیم کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور ترجمہ کیا تھا اور ترجمہ کے ذریعہ اس کے رموز و نکات کو سمجھنے کی بھی کوشش کی تھی جس کا اظہار اُن کے کلام میں آمد کی شکل میں ملتا ہے۔ جگہ جگہ قرآنی آیات اور اس کے مفاہیم کا استعمال اور اشعار میں اُس سے بھرپور استفادہ، اقبالؔ کی قرآن سے گہری دلچسپی اور عمیق مطالعہ پر دلالت کرتا ہے۔ (ص ۳۵ تا ۳۶)

پروفیسر صدیقی اقبالؔ کو صوفی شعرا میں شمار نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک اقبالؔ کی شاعری کو متصوفانہ، اسلامی یا مذہبی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں اور بحیثیت مجموعی عظیم اور الہامی اقدار کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔

❀❀

غالبؔ کی حکیمانہ دانش اور فہم و فراست

’’اسالیبِ فکر‘‘ میں تیسرا مقالہ ’’غالبؔ کی حکیمانہ دانش اور فہم و فراست‘‘ کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ یوں تو غالبؔ پر بے شمار مضامین و مقالات اور تصانیف اردو بلکہ ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ غالبؔ کی زندگی کے کما حقہ زیر بحث آ چکے ہیں لیکن غالبؔ کا مذکورہ پہلو پر شاید کم ہی لکھا گیا ہے۔

پروفیسر صدیقی کی غالبؔ کے اس پہلو پر نظر گئی اور اُنہوں نے بڑے انہماک و دلجمعی کے ساتھ مذکورہ مقالہ قلم بند کیا۔

اگر ہم غالبؔ کے اس پہلو پر غور کریں تو بہت سی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں کہ ہم ہر شخص کو آدمی یا انسان سمجھتے ہیں جبکہ غالبؔ جیسے فلسفی کی نظر میں آدمی ہونا ہر فرد اور ہر شخص کے لیے آسان ہے لیکن آدمی ہونے کے بعد تہذیب نفس کی تربیت اور زندگی کی اعلیٰ قدرں سے مزین ہونا بھی لازم و ملزوم ہے، جو شخص اِن صفات سے مرصع ہوگا وہی انسان کہلانے کا حق رکھتا ہے انسان میں انسانی صفات خود بخود مضمر ہوتی ہیں۔ جب آدمی میں انسان کی اعلیٰ قدریں نہ ہوں اُس وقت تک وہ انسان کہلانے کا بھی مجاز نہیں ہوسکتا۔ انسان کے بارے میں جس قدر اقبالؔ اور میرؔ نے لکھا ہے شاید دنیا کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں لکھا۔ اقبالؔ اور میرؔ کی طرح غالبؔ کے یہاں یہی انسان دوستی کی صحت مند و اعلیٰ قدروں کا سراغ ملتا ہے غالبؔ کے اس پہلو پر پروفیسر صدیقی نے اِس طرح روشنی ڈالی ہے:

غالبؔ کی شاعری میں حکیمانہ دانش و بصیرت انسان کی عظمت اور انسانیت کا تصوّر بہت مثبت نظر آتا ہے۔غالبؔ کی دانش و بصیرت عقلیت پسندانہ (Rationalstic) تھی۔اُن کے یہاں انسان اور انسان کی عظمت اور اس کی قوت کا تصور اپنے عہد کے نشاۃ ثانیہ سے ماخوذ ہے کیونکہ انسان سازی ہی کائنات کا پیمانہ ہے۔غالبؔ کی انسان دوستی سے ادب میں سائنٹفک شعور پیدا ہوا۔اُنہوں نے انسانی مساوات اور برابری نیز انسان کی محرومیوں اور مجبوریوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ان کے یہاں حرکت ہے،عمل ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔(ص ۳۹)

انسان دوستی غالبؔ کے فلسفہء حیات کی بنیادی شرط ہے۔غالبؔ کا تصوراتی انسان اخلاقی گنہگار،خطا کار لیکن صداقت کا متلاشی ہے۔غالبؔ زہد اور تقویٰ کو اصل انسان تصور نہیں کرتے کیونکہ عبادت خود راست بازی یا حق گوئی کی ضمانت نہیں ہے۔اِس نکتہ کو پروفیسر صدیقی نے یوں بیان کیا ہے:

غالبؔ نے انسانی فلسفے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جہاں غالبؔ کی عظمت کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں وہیں ان کا مرکزی پہلو انسان دوستی،ترقی پذیر خیالات اور فکر ہے اور ہر اعتبار سے جدّت حاوی نظر آتی ہے۔غالبؔ کی زندگی بذات خود محرومیوں کا شکار تھی،ان کے کوئی اَولاد بھی نہیں تھی۔انہوں نے انسان کی قدر و قیمت کو پہچانا اور زندگی کو برتا اور اس سے جو فلسفہ ابھر کر آیا اِسے پیش کیا۔(ص ۳۹ تا ۴۰)

غالبؔ کے فلسفہء اخلاق میں ایک توجہ طلب بات یہ ہے کہ اُس نے کبھی مسلم مفکرین کی

طرف آنے والی دنیا کی فکر کی تلقین نہیں کی بلکہ عالم آب وگل کے دُکھ درد کی توجہ دلائی ۔ غالبؔ کیونکہ قدیم اور جدید قدروں کے دوراہے پر کھڑے تھے، اِس لیے وہ کشمکش کا شکار بھی ہوئے اُن کی شاعری اسی کشمکش کا بھی آئینہ دار ہے ۔ ترک و اختیار کی کشمکش میں مایوس نہ ہونا اور راستہ تلاش کر لینا دراصل پناہ گاہ تلاش کر لینے کا دوسرا نام ہے ۔ لہٰذ غالبؔ کے خیالات جدید اور قدیم نظریوں کے آئینہ دار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں گہرا تضاد بھی موجود ہے ۔ اِس پہلو پر پروفیسر صدیقی مدلل گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غالبؔ عینیت پسند اور صوفی مشرب تھے ۔ ان کا متجسس ذہن کائنات اور انسانی زندگی کے مسائل کی گرہ کشائی میں لگا رہتا تھا ۔ اُن کے یہاں اُن ہی فلسفیانہ نظریوں کا شعور اور عکس ملتا ہے جو انہوں نے طوسی، بوعلی سینا، عراقی، غزالی، جامی اور رومی سے ذہنی ورثہ کے طور پر پائے تھے، تاہم ان کی فکر میں ذاتی انکشافات کی تازگی موجود ہے غالبؔ کے لیے پوری کائنات ایک سوالیہ نشان ہے اور اس کے اسرار و رموز کی پردہ داری بھی، وہ کسی بندھے ٹکے نظریے یا مسلمہ نظام کی مدد سے نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کا حکیمانہ ذہن اُن مختلف مسائل کی توجیہ زیادہ تر اپنی توانائی کے بل بوتے پر کرنا چاہتے تھے غالبؔ کی حکیمانہ دانش کی مثالیں، ان کے کلام کے متعدد اشعار سے دی جاسکتی ہیں ۔ (ص ۴۱)

غالبؔ، گوئٹے کے ہم عصر تھے اور ٹالسٹائی کے بھی ۔ غالب کا انتقال اُسی سال ہوا جب روسی ادیب نے اپنا معروف ناول ''جنگ اور امن'' (War and Peace) مکمل کیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کے فلسفہ اخلاق میں ترقی پسند رجحان کا سراغ بھی ملتا ہے ۔ اِسی قسم کے ترقی پسند خیالات انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی سماجی فضا میں نمودار ہونے لگے تھے اگرچہ

معاشرہ اپنی سماجی نفسیات میں بھی جاگیری تھا، جہاں علما اور اشرافیہ انسان کو بے حقیقت اور حقیر ہونے کا درس دیتے تھے جاگیردار پرولتاریہ طبقے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔غلام روحوں کے معاشرے میں انسان کی عظمت کا ذکر کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔غالبؔ نے انسان کی عظمت وسر بلندی کے معاملے میں نہ تو سامراجی قوتوں سے سمجھوتا کیا اور نہ ہی مقامی اشرافیہ سے۔ ایک جگہ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> غالبؔ نہ اپنے ماضی سے مرعوب تھے نہ اپنے حال سے اتنے خوفزدہ کہ تلاش کا حوصلہ چھوڑ بیٹھتے۔اس لیے انہوں نے نہ تو اپنے پیش روؤں کی روایات پر تکیہ کیا، نہ اپنے عہد کی اطاعت قبول کی۔زندہ رہنا ایک طرح کی بے بسی میں مبتلا ہونا سہی مگر غالبؔ کی طبیعت نے کسی بھی مقدر کو بے چوں چرا قبول کر لینے پر آمادہ نہ تھی۔''(ص۴۳)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے غالبؔ کی حکیمانہ دانش اور فہم وفراست پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر غالبؔ شاعر یا نثر نگار نہ بھی ہوتے تو وہ کسی اور میدان میں بھی ایک کامیاب انسان ثابت ہو سکتے تھے۔

❁❁

پریم چند کی کہانیوں میں سماجی شعور

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اسالیبِ فکر میں ''پریم چند کی کہانیوں میں سماجی شعور'' پر ایک جامع اور قابل مطالعہ مقالہ شامل کیا ہے، جو موصوف کی تخلیقی ادب، بالخصوص پریم چند کی کہانیوں سے گہری دلچسپی کا مظہر ہے۔ تخلیقی ادب کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> سماج کے بغیر تخلیق کار کا تصور ممکن نہیں، گویا سماج اور تخلیق ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں کیونکہ تخلیق کار سماج میں رہ کر ہی اپنے تخلیقی ادب پاروں کے لیے مواد فراہم کرتا ہے اگر کسی تخلیق کار کو سماج سے ہٹ کر کسی گوشۂ عافیت میں مقید کر دیا جائے تو وہ تخلیق کار اپنی تحریروں میں تخلیقیت کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔ کسی بھی عہد کے ادب پاروں میں سماج کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے لیکن ہر تخلیق کار کے سوچنے کا انداز الگ ہوتا ہے۔ (ص ۴۵)

اردو افسانہ بیسویں صدی کے اوائل میں ظہور پذیر ہوا جس میں اِس خطے کا عکس موجود ہے اُس کے وقت افسانوں میں دیہی زندگی کے احوال وکوائف اور لوگوں کے جذبات بڑی دیدہ ریزی سے بیان کیے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اِس خطے کی سیاسی صورت حال بھی بدل گئی تھی انگریزوں کا دورِ اقتدار شروع ہو چکا تھا۔ اِس طرح لوگوں کی سوچ بھی بدلنا شروع

ہوگئی تھی جس نے انسان کو اپنی ذات کی طرف مائل کیا جس سے ادب میں بھی ایک زبردست تبدیلی آئی۔ اِس حوالے سے پریم چند کے ذکر کے بغیر اردو افسانہ نگاری کی روایت سے واقف ہونا ممکن نہیں ہے۔

پریم چند نے اپنے فن پاروں میں سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے عوام کے کئی مسائل کو پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں بڑی چابکدستی سے تہذیبی شعور کے دکھ درد کو منظر میں لاتے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر صدیقی کا تجزیہ قابلِ غور ہے:

> پریم چند ایک باشعور تخلیق کار تھے۔ حالات کے تھپیڑوں نے انہیں نت نئے تجربات سے روشناس کرایا، جس کا اظہار ان کی کہانیوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ پریم چند کی کہانیوں کے کردار اگرچہ فرضی ہیں لیکن ان کا عمل حقیقی نظر آتا ہے شاید یہی اُن کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔'' (ص ۴۵)

پریم چند کے سماج کا المیہ یہ ہے کہ اس میں ارتقائی عمل رک سا گیا ہے، لوگ جیسے ہیں ویسے ہی بے معنی زندگی کا تصور کرتے ہیں، ان میں تگ و دو کا مادہ قطعی نہیں ہے اور سماج دراصل بے حسی کا لبادہ اوڑھ کر بعض بے معنی سماجی قدروں، روایتوں اور مذہبی میلانات کے آگے لاچار نظر آتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے ابتدائی افسانوں کے مقابلے میں آخری عمر کے افسانوں میں معاشرے میں ہو رہے ظلم و زیادتی کے کئی تلخ حقائق کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس حوالے سے پریم چند کی کہانیوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> پریم نے چند ایک ایسے معاشرے میں آنکھ کھولی تھی جہاں انسانیت کا تصور بہت کم تھا۔ سود خور مہاجن کسانوں اور غریب عوام کا خون چوس رہے تھے، پسماندہ طبقہ کا استحصال کیا جا رہا تھا، پریم چند اپنی کہانیوں میں سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور

بد عنوانیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں کے موضوعات متنوع ہیں اور کردار بھی مختلف اِسی لیے ان کی تخلیقیت کے اعلیٰ نمونے کہانیوں ہی میں ملتے ہیں ابتدا میں پریم پر راجپوتیت کا اثر تھا اور برسوں تک ان پر راجپوتیت چھائی رہی ۔''رانی سارندھا، گناہ کا اگن کنڈ ،راجہ ہر دول'' یہ بڑی تجرباتی کہانیاں ہیں ،فنی اعتبار سے پریم چند کی کہانیوں میں ''کفن عیدگاہ، دو بیلوں کی کتھا، سوتیلی ماں'' بہت اہم ہیں اِن کہانیوں میں پریم چند سماج میں پنپتی ہوئی مختلف کوتاہیوں اور طبقاتی کشمکش کو زیر بحث لائے ہیں۔''(ص ۴۸)

پریم چند کے افسانوں کے اِس اجمالی جائزے کے بعد افسانوی ادب میں دیہی زندگی کی حقیقت نگاری کے متعدد پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ دیہات کی صورتحال، وہاں کی تہذیب وتمدن زبان و بیاں اور لباس ،اُن کے مذہبی نظریات اور اِن نظریات کے متعلق توہمات اور اعتقاد پنچایتوں کا نظام ،خلوص و وفا خوش حالی اور کسمپرسی کی زندگی اور اس کے مسائل، دیہی سماج کی سادہ لوحی زمیندارانہ نظام پولیس کے مظالم اور اُن کا جبر و استبداد، دیہاتوں میں ایک دوسرے کے مابین تلخ وشیریں رویے، میل جول، دشمنی، کدورت اور محبت و رفاقت غرض کہ کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جسے پریم چند نے اپنے فن پاروں میں جگہ نہیں دی۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

پریم چند کی کہانیوں میں حق وانصاف بھی ہے،عدل وشجاعت بھی طبقاتی کشمکش بھی ہے اور سماج کے اعلیٰ کردار بھی، حقیقت نگاری بھی ہے اور ظلم واستبداد کا بیان بھی ،سیاسی شعور بھی ہے اور گہرے طنز بھی مظلوم طبقے کی زبوں حالی کا بیان بھی ہے اور سماجی حقیقت بھی ۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں سماج کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔انہوں نے

سماج میں پھیلی بدعنوانیوں کی بھرپور نقاب کشائی کی ہے۔''

(ص۵۰)

پروفیسر صدیقی نے پریم چند کو ایک اعلیٰ پایہ کا تخلیق کار بتاتے ہوئے ایک سچا اور درد مند ادیب کہا ہے، جس کے بغیر افسانوی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

❀❀

فیضؔ کے نثری افکار

اسالیبِ فکر کا پانچواں مقالہ ''فیضؔ کے نثری افکار'' پر مبنی ہے۔فیضؔ بیسویں صدی کے اُن خوش قسمت شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنہیں اپنی زندگی میں ہی بے پناہ شہرت ومقبولیت اور عظمت نصیب ہوگئی تھی۔فیضؔ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں لیکن شاعری میں ایک نئی روایت کے علمبر دار بھی ہیں کیونکہ ان کے یہاں دیگر ترقی پسندوں کی طرح تلخی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔علاوہ ازیں فیضؔ کا نثری اسلوب بھی جو اُن کی شاعری کی طرح ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے جس میں نہ صرف ان کے کردار کی صحیح تصویر نمایاں طور پر نظر آتی ہے بلکہ فیضؔ کے خیالات و نظریات کے عکس ذہنی رجحانات بھی موجود ہیں۔حالانکہ فیضؔ کی مقبولیت کی بنیادی وجہ ان کا شعری کلام ہے لیکن ادب میں اُن کے نثری فن پاروں کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، گو کہ اربابِ نقد ادب نے کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا، بقول پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے:

> نثر میں بھی فیضؔ کے چند مجموعے ملتے ہیں جن کی طرف ہمارے ناقدین اور اربابِ نظر نے ابھی تک توجہ نہیں دی البتہ ''فیضؔ: ایک نثر نگار'' کے عنوان سے سحر انصاری کا ایک مضمون نظر سے گزرا جو صرف ''میزان'' کی روشنی میں لکھا گیا ہے میزان کے علاوہ فیضؔ کے نثری مجموعوں میں ''صلیبیں اپنے دریچے میں، مہ وسالِ آشنائی، ہماری قومی ثقافت، متاعِ لوح و

قلم‘‘اور’’سفرنامہ کیوبا‘‘ شامل ہے۔فیضؔ نے چند مضامین اور دیباچے بھی لکھے ہیں جن میں ’’دست صبا،نقش فریادی، دست تہ سنگ‘‘اور’’ کلام فیضؔ‘‘ کے دیباچے قابل ذکر ہیں۔‘‘

(ص۵۱)

فیضؔ کی عربی، فارسی اور انگریزی زبان پر بھی گہری نظر تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مختلف اسالیب کو سامنے رکھ کر ایک نئے اسلوب کا تجربہ بھی کیا،جن کا اردو کی نثری روایت میں خاص اہمیت ہے۔فیضؔ نے نثر میں جو تجربے کیے وہ مدلل، جامع اور عام فہم ہیں۔فیضؔ کی نثر خشک اور بے کیف بھی نہیں ہے۔اِس پہلو پر، پروفیسر صدیقی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

فیضؔ کی نثر اکثر و بیشتر سادہ،شگفتہ، وقیع اور برمحل ظرافت سے معمور ہوتی ہے۔تحریر میں طنز و ظرافت کی آمیزش سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہے جس کو پڑھ کر تبسم کی لکیر اُبھر آتی ہے ۔نثر نگار کی حیثیت سے فیضؔ نے الفاظ کی ترتیب اور انتخاب میں بیشتر اوقات ذمہ داری سے کام لیا ہے اور خیال کو صحیح الفاظ میں پیش کرنے کے لیے کلچر یافتہ اہمیت اور نااہمیت ،تجربات کا تجربہ، جذباتی وفاداری اور اِس قسم کی بہت سی تراکیب وضع کی ہیں۔(ص۵۵)

فیضؔ نے اپنی شگفتہ نثر میں جمالیاتی اقدار کا بھی خیال رکھا ہے چنانچہ کہیں کہیں تشبیہات اور استعارات سے کام لیا ہے،بعض جگہ تصویر کشی کی ہے اور کہیں جزئیات نگاری کو جمالیاتی انداز میں پیش کرنے کے لیے اپنے نثری اسلوب میں دلکشی پیدا کی ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے فیضؔ کی ہر تخلیق،خواہ وہ شعری ہو یا نثری یا نجی مکتوبات کی صورت میں؛ ادب کا بیش بہا سرمایہ بتایا ہے۔

❀❀

جوشؔ کا فن

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''اسالیب فکر'' میں جوشؔ ملیح آبادی پر ایک وقیع مقالہ '' جوشؔ کا فن'' شامل کیا ہے۔ عام طور پر جوشؔ شاعر انقلاب مشہور ہیں، اس شعر میں یہ اعلان کرتے ہیں:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

شاید درست بات یہ ہوگی کہ جوشؔ شاعر بغاوت ہیں کیونکہ انقلاب کا مطلب ایک نظام کو بدل کر دوسرا نظام لانے کی کوشش کرنا ہوتا ہے، جبکہ بغاوت صرف ایک نظام کو سبوتاژ کرنے کا نام ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں کسی نئے نظام کا پیغام تو نہیں ہے البتہ اس میں کئی طرح کی بغاوتیں پورے تزک و احتشام کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے آل احمد سرور، پنڈت کشن پرساد کول اور عزیز احمد کے تنقیدی استدلال کی روشنی میں، اِسی رعب داب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اِن تمام خامیوں کے باوجود فن پر جوشؔ کی گرفت دبیز ہے جوشؔ کی نظمیں '' شکست زنداں کا خواب، بغاوت، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، کسان، گنگا کے گھاٹ پر خاتون مشرق، کوہستان دکن کی عورتیں، فتنۂ خانقاہ، سہاگن بیوہ

لافانی حروف، جنگل کی شہزادی، البیلی صبح، یوم بہار، گرمی اور دیہاتی بازار' جوشؔ کی فنکاری کے بہترین نمونے ہیں جوشؔ کی شاعری ایک قوسِ قزح ہے، جس میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ وہ شاعر جذبات بھی ہیں اور شاعر انقلاب بھی ان کے یہاں حسن کی چاہت بھی ہے اور جمال کی خواہش بھی گویا جوشؔ کا کلام ایک کلکسٹر ہے جس میں نیرنگیوں کے ساتھ تہہ داری بھی ہے۔'' (ص۵۹)

جوشؔ کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تنقیدی نقطۂ نظر کی تائید، پروفیسر محمد حسن کے ایک اقتباس سے ملتی ہے:

جوشؔ کا کلام لفظوں کی انمول اور بے مثال قوسِ قزح ہے، رنگ احساس اور تصور ایسا خزانہ جس کی مثال سوداؔ، نظیرؔ اور انیس کے علاوہ ہزار سال کے دورِ ادب میں ناپید ہے۔''

جوشؔ کے فن کی مختلف النوع خصوصیات ان کی فطری اور موروثی شاعرانہ صلاحیت سے عبارت ہے۔ وہ ایسے علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن میں کئی پشتوں سے شعر گوئی کا چرچہ عام تھا اور یہ شعر گوئی کی روایت جوشؔ کو وراثت میں ملی تھی۔ ان کی شاعری میں بے پناہ روانی اور سلاست ہے۔ الفاظ کا سیل رواں امنڈتا اور شور مچاتا، اُن کے کلام میں نظر آتا ہے۔ جوشؔ کے یہاں پے در پے تشبیہوں اور استعاروں کا ایسا برجستہ اور بے برمحل استعمال ہے کہ پڑھنے والا ان کے الفاظ کی گھن گرج کے علاوہ اُن تشبیہوں اور استعاروں کے طلسم میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی لیے وہ الفاظ کی کثرت وقدرت اور وزن، قافیہ کی پابندی کے ذریعے قاری یا سامع کے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ جوشؔ کی انہیں خصوصیات کے بیان میں پروفیسر صدیقی نے بڑی خوبصورت گفتگو کی ہے:

اُن کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے، بڑی رنگارنگی اور

قادرالکلامی ہے۔حسین جگمگاتی تشبیہیں، پراثر منظر نگاری اور شاعرانہ مصوری کے بڑے جاذب نظر نمونے ملتے ہیں۔وہ کبھی اپنی پرواز میں غالبؔ اور اقبالؔ کی سرحدوں کو چھو لینے کی کوشش کرتے ہیں۔جوشؔ ایک پھول کے موضوع کو سو رنگوں نہیں، سو لفظوں سے باندھنے کی عادی ہیں۔وہ تشبیہوں اور استعاروں کی جگمگاہٹ کو فنکاری کا درجۂ کمال تصور کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اندازِ بیان جس قدر پرشور ہوگا،اس قدر کلام میں تاثیر پیدا ہوگی،اِسی لیے ان کے یہاں الفاظ کی گھن گرج لفظوں کی بازی گری اور سحر آفرینی ہے۔''(ص ۵۸)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے جوشؔ کی نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کے حوالے سے ان کا محاکاتی شعور پختہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ الفاظ کے ساتھ ساتھ منظر نگاری پر بھی یدطولیٰ حاصل تھی پروفیسر صدیقی، جوشؔ کی ''نظم فتنۂ خانقاہ'' کی تفہیم وتشریح میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی ایک نظم ''فتنۂ خانقاہ خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے شیوخ کا مضحکہ اڑاتے ہیں کہ جب ایک دوشیزہ کسی خانقاہ میں فاتحہ پڑھنے کے لیے جاتی ہے تو خانقاہ میں داخل ہوتے ہی شیوخ کا ایماں لرزہ براندام ہوجاتا ہے۔

پروفیسر صدیقی نے جوشؔ کی بعض خامیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جوشؔ کے ادبی کارناموں کو سراہا ہے اور ایک بہترین فن کار کے طور پر پیش کیا ہے۔

❁❁

جوشؔ کی نظموں میں رومانیت

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ایک دوسرے مضمون بعنوان 'جوش کی نظموں میں رومانیت' کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔اوّل یہ کہ موصوف نے مضمون کی ابتدا میں لفظ ''رومان'' کی تاریخ، لسانی ساخت و معنی کا احاطہ اور اس کے اِرتقائی عمل اور بتدریج ارتقا پر مفصل ،مدلل اور جامع گفتگو کی ہے بلکہ وقار عظیم، پروفیسر محمد حسن اور احتشام حسین جیسے کئی معتبر ناقدین کے توضیحی کلمات کو بھی اپنی گفتگو کا حصہ بنایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> لفظ رومانیت ''رومان'' سے ماخوذ ہے اور رومن زبان سے مشتق ہے قدیم لاطینی میں اِسے رومانکا (Romanca) اور فرانسیسی میں اِسے رومان (Roman) کہا جاتا رہا ہے ایک خیال یہ بھی ہے کہ اِس لفظ کے معنی جنوبی یورپ کی اُن جدید زبانوں کے لیے جانے جاتے ہیں جو لاطینی ،رومنی صومالی فرانسیسی اور رومانی (Romanian) وغیرہ زبانوں میں سے مل کر بنی ہو۔'' (ص ٦٦)

دراصل ''رومانہ زبان'' کا ابتدائی اَدب حسن و محبت کی قدیم داستانوں پر مبنی تھا جس میں تخیلاتی واقعات کو مبالغہ طرازی کے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔اِس قسم کا ادب جس کی اساس خیال آرائیوں پر منحصر ہو، رومانی ادب کہلاتا ہے۔رومانیت ایک مخصوص انداز کی کیفیت کا نام یا

نفس کی ایک خاص حالت کو رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں جس میں جذباتی کیفیات، عقلی کیفیات سے نمایاں اور تخیلاتی واقعات کو مہمیز کیا جاتا ہے۔ انور سدید کے مطابق رومانیت اُس کیفیت کو پالینے کا نام ہے کہ جب انسان کا مادی وجود ہمہ تن جذبے میں تحلیل ہو کر جسم کو پَر لگا دیتا ہے۔

غرض کہ رومانیت کے حوالے سے بہتوں نے مختلف معنی و مفہوم بیان کیے ہیں اور اس کی معنوی حیثیت بھی متعین کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے البتہ پروفیسر صدیقی نے اپنے تفصیلی مضمون ''جوشؔ کی نظموں میں رومانیت'' میں لفظ ''رومان'' کے حوالے سے اپنے ضمنی خیالات اِس طرح قلم بند کیے ہیں:

> بہر حال جوں جوں اِس لفظ کے معنی و مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اِس لفظ کے نئے نئے گوشے اور مطالب سامنے آتے ہیں۔ اِس میں لفظ ''رومان'' کی اپنی ایک تاریخی معنویت ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں معانی کی ایک کائنات پوشیدہ ہے۔'' (ص ٦٧)

اٹھارہویں صدی کے وسط تک سائنسی ترقی اور نظریات نے ہر چیز کو عقل کے ماتحت بنایا تھا اور وکٹوریہ عہد کی کلاسیکی تحریک نے مادی نظریات کو فروغ دینے کی کوشش میں روحانی و جذباتی منشا کو زیر بار کر دیا تو حساس ذہنوں میں اضطراب پیدا ہو گیا، جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس مصنوعی انداز فکر کی قید و بند سے راہِ فرار تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے اور اِس طرح رومانی تحریک کا آغاز ہوا جو اصل میں کلاسیکی تحریک کا ردعمل تھا۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی نے لکھا ہے:

> یہ عام فہم لفظ جو 'رومان' کے نام سے جانا جاتا تھا، مختلف علاقوں اور خطوں سے سفر کرتا ہوا اٹھارہویں صدی کے اواخر تک ایک ادبی تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور اِسے ادب میں ''رومانی تحریک'' کے نام سے موسوم کیا جانے لگا، اِس تحریک کی ترویج و اِرتقا اور فروغ میں بنیادگزار کے طور پر چند نام سامنے آتے

ہیں۔اُن میں روسو، ورڈز ورتھ، کالرج بائرن، شیلے، کٹیس مسز ریڈ، کلف، ولیم بیک فورڈ، ایملی، برونٹے والٹر سکاٹ ہرڈر اور وکٹر ہیوگو، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔'' (ص ٦٨)

اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب میں رومانی تحریک، سرسید کی عقلیت پسند اور مقصدیت کا ردّعمل تھی ،تو غلط نہ ہوگا کیونکہ سرسید کی تحریک نے اردو ادب میں حقیقت نگاری اور مقصدیت کو اِتنا فروغ دیا کہ لوگوں کے رومانی جذبات کچل کرہ گئے۔رومانی تحریک کے فروغ میں، اِس خطے کے سیاسی حالات بھی بہت اہم ہیں۔انگریزوں کے قبضے نے لوگوں میں جذبہ حریت کو جنم دیا جس سے ان میں آزادی کی خواہش پیدا ہوئی۔اِس تحریک نے تقریباً چار دہائیوں تک ہر صنفِ سخن کو اپنے داخلی سحر اور لا ابالی پن سے متاثر کیے رکھا لیکن آگے چل کر رومانی تحریک کو بھی ردّعمل کا سامنا کرنا پڑ ،یعنی جذبات کی رو نے اپنے لیے دو راستے نکال لیے، اُن میں ایک حلقۂ اربابِ ذوق کی جانب مڑ گیا اور دوسرا ترقی پسند مصنفین کی صفوں میں شامل ہوگیا اور اس طرح رومانی تحریک زوال پذیر ہوگئی۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا مندرج ذیل اقتباس بڑی اہمیت رکھتا ہے:

رومانی تحریک کے ابتدائی نقوش اردو ادب میں غیرشعوری طور پر رونما ہوئے ،اِس تحریک کو علی گڑھ تحریک کے ردّعمل کے طور بھی دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ علی گڑھ تحریک کے تحت اُس دور کے ادب میں عقلیت پسندی اور استدلالی طرزِ فکر پر زور دیا جاتا تھا۔نتیجے کے طور پر ادب میں مقصدیت غالب آنے لگی تھی۔اِس کے برخلاف ادیبوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو تخیل کی کارفرمائی اور جذبہ اور خیال کی آزادی چاہتا تھا۔اِس رجحان سے تعلق رکھنے والے ادیب رومانوی ادیب کہلائے اِس طرح رومانیت ان کے تخلیقی پاروں کا شمار، رومانوی ادب

میں کیا جانے لگا۔'' (ص ۶۹، ۷۰)

رومانی تحریک کو مستحکم کرنے میں رسالہ ''مخزن'' کا بھی غیر معمولی کردار رہا تھا، اِس رسالہ کے وسیلے سے ایسے کئی ادیب وشعرا، جن میں اقبالؔ، ابوالکلام آزادؔ، نیازؔ فتح پوری یلدرم اور جوشؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گہرے رومانی طرزِ احساس کے شاعر جوشؔ ملیح آبادی کا شمار بھی اُن شعرامیں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا اور بعد میں نظم کی طرف مائل ہوگئے نظم کی طرف مائل ہونا، اُن کی طبیعت کا تقاضہ تھا۔ اُن کی شاعری جدید میلانات ورجحانات سے معمور ہے اور عصری تقاضوں کی عکاس بھی۔ جوشؔ کی نظمیں دورِ شباب کی لغزشوں کی حکایتوں کا روپ ہیں لیکن جنگ عظیم اوّل کے دوران جوشؔ کے افکار میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے گویا وہ سیاسی وسماجی بحران میں مبتلا ہوگئے ہوں، لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد جب سیاست ٹھنڈی پڑنے لگی تو جوشؔ کی طبیعت میں اِس تبدیلی کے سبب رومانیت پیدا ہوگئی۔ ''عاشق نواز، چاند کے انتظار میں، جفائے وفا، پہلی مفارقت'' اور ''زرد کلیاں'' جیسی اُس دور کی یادگار اور مشہور رومانی نظمیں ہیں۔ یہاں ہمیں جوشؔ ایک فطرت پرست اور نوجوان عاشق کے طور پر نظر آتے ہیں۔

پروفیسر صدیقی نے جوشؔ کی ایسی کئی نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

> جوشؔ ملیح آبادی کا شمار اردو کے بلند پایہ رومانی شاعروں میں ہوتا ہے اُن کے یہاں کہیں روایت کی پاسداری ہے تو کہیں روایت سے بغاوت جوشؔ کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ ساتھ جذبات کی فراوانی بھی ہے۔ جوشؔ شاعر شباب بھی ہیں، شاعر انقلاب بھی شاعر فطرت بھی ہیں اور شاعر جذبات بھی۔ بہرحال ان کی شاعری میں رومانیت کا پہلو ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔'' (ص ۷۴)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> جوشؔ طبیعتاً حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ اُن کے کلام میں

حسن و جمال کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ نظم ''جنگل کی شہزادی'' میں ریل کے سفر کی تصویر اِس طرح پیش کرتے ہیں کہ ممکنہ پوشیدہ گوشے اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ مرئی اور غیر مرئی پیکر کی شکل میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں، گویا حسن کے بیان میں حیات و کائنات کا مشاہدہ ہے۔''

(ص ۷٦)

جوشؔ کی طبیعت میں ہنگامہ تھا اور فطرت سے وابستگی، یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی نظمیہ شاعری کے ذریعے جوء کاسی کی ہے، اُسے پڑھ کر قاری اثر گیر ہو جاتا ہے۔ اُنہوں نے محنت کش عوام میں زندگی کے اصل معنی تلاش کیے اور محنت کش عورتیں، جن کی تصویریں جوشؔ کے کلام میں نظر آتی ہیں؛ جوشؔ میں رومانیت کا گہرا رنگ چڑھا دیا تھا۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی کہ شعری جہات اپنے تخلیقی توانائی کے اعتبار سے جوشؔ کا نام اردو کی ادبی تاریخ میں ایک تابناک باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جوشؔ لسانی سطح پر بہت حساس تھے۔ پروفیسر صدیقی نے جوشؔ کو لفظیات (Diction) کا بادشاہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ: اُن کے کلام میں الفاظ سیلِ رواں امنڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

❀❀

قائمؔ شناسی - ایک تجزیہ

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا تحریر کردہ زیرِنظر مضمون قائمؔ چاند پوری اور اُن کے معاصرین میر تقی میرؔ، محمد رفیع سوداؔ وغیرہ کے درمیان قابل غور و دلچسپ تقابلی مطالعہ ہے۔

ہر عہد کے کچھ خواص ہوتے ہیں، ان میں کچھ امتیازات ہوتے ہیں جو دوسروں سے اِسے یگانہ بناتے ہیں۔ ایک زمانے کی معروضی صورت حال، دوسرے زمانے سے مختلف ہوتی ہے لیکن ایک تاریخی کڑی میں یہ تمام حالات ایک دوسرے میں اِس طرح وابستگی رکھتے ہیں کہ ایک زمانے کے اچھے برے، منفی یا مثبت اثرات دوسرے زمانے پر لازماً پڑتے ہیں۔ کسی بھی علاقے کا سیاسی، سماجی معاشی اور معاشرتی منظر نامہ اور اُس کے حسی اِدراکات، میلانات او رجحانات جب دوسرے عہد میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی یہ منتقلی غیر محسوس طریقے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔

لہٰذا ایک شاعر اور ادیب کی زندگی، اپنے وقت کے مسائل، علوم وفنون اور متواتر رونما ہونے والے واقعات میں بسر ہوتی ہے، اس طرح عصریت کی چھاپ، اس کے ذہن وشعور پر بھی یقیناً پڑتی ہے اور وہ اِنہیں عوامل کو اپنی شخصیت میں جذب کر کے آفاقیت عطا کرتا ہے۔ اس کے گونا گوں تجربات ومشاہدات اس کی تخلیق سے مترشح ہوتے ہیں۔

قائمؔ چاند پوری اٹھارہویں صدی کے شروع کے شعرا میں سے ہیں اور میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے ہم عصر ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی اور دیگر اصنافِ سخن میں قائمؔ نے

خوب طبع آزمائی کی ہے، بالخصوص قطعات ورباعیات کے میدان میں نمایاں عکس چھوڑا ہے۔قائم قابل رشک شعری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ان کی بیکراں خوبیوں کے متعلق پروفیسر صدیقی لکھتے:

> قائم کا دیوان اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مختصراور اہم ہے،ان کے کلام میں شاعرانہ اور سہل ممتنع کے علاوہ اخلاقیات،مبالغہ آرائی،تصوّف،سیاست اور فحاشی جیسے موضوعات پرمعیاری اشعار موجود ہیں۔سہل ممتنع میں تو قائم کو یدطولیٰ حاصل تھی،اس فن میں تو وہ کہیں کہیں غالبؔ سے بہت آگےنظر آتے ہیں۔(ص۸۹)

قائم چاندپوری ایک ایسے باکمال شاعر ہیں جن پرخاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی بلکہ وہ عام طور پرناقدین اورادبی مورّخین کی بے اعتنائیوں کا شکار ہوئے ،حالانکہ معدودے چند ناقدین نے قائم چاندپوری کا تذکرہ نہایت احترام سے کیا ہےلیکن اُن کی ادبی خدمات کا یہ اعتراف بھی سرسری ہے،نہ اُن کے شایانِ شان،جس کے وہ مستحق ہیں،جس طرح قائم چاندپوری کے ہم عصر شعرا مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میرتقی میرؔ زبانِ زدعام ہوئے اورحیاتِ جاودانی حاصل ہوئی،وہ قائم چاندپوری کے حصے میں نہیں آئی۔قائم چاندپوری کے کلام میں پختگی اورغزل کے مصرعوں کی چستی،وہ قصیدہ مثنوی کی طرز میں زمانے کے موافق استاد کی راہ پر چلتے تھےاور بسا اوقات ان سے آگے بھی نکل جاتے تھے۔قائم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے مختصر سے دیوان میں شاعری کی تمام لفظیات اورمعنوی خوبیوں کو جمع کردیا ہے۔ان کے یہاں غالبؔ کا سا رنگ اور میرؔ کا سا استفہام تو نہیں ہےلیکن ایک تحیر اور تجسّس ضرور ہے جو کائناتی موضوعات میں قائم چاندپوری کے لہجہ کو بالکل نیا اورمنفرد کردیتا ہے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے ژرف و عمیق مطالعے اورتحقیق کے بعد اِس ادبی قضیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے قائم چاندپوری کی ادبی حیثیت کومستحکم کیا ہے:

> قائم کی زندگی کے حالات، پیدائش وپرداخت مشکوک بھی ہیں

غیر مستند بھی اور متنازعہ فیہ بھی ،اس سے متعلق بعض روایات تو بالکل فضول معلوم ہوتی ہیں۔قائمؔ چاند پوری مزاجاً خوددار طبع اور صوفی منش واقع ہوئے تھے،مزاج میں بے نیازی آزاد منشی اور قلندری زمینوں کے قضیے اور دیگر دنیاوی معاملات میں ملوث ہونے کی وجہ سے قائمؔ کی شاعری نظر انداز ہوتی گئی۔محمد حسین آزادؔ جو دہلی سے باہر کے ہر شاعر کے بارے میں کچھ نہ کچھ ڈھکے چھپے تعصّبات رکھتے تھے،وہ قائمؔ کے دیوان مومیر و مرزا سے کم درجہ کا نہیں سمجھتے ،لیکن انہوں نے آب حیات میں قائمؔ کا ایک بھی شعر درج نہیں کیا۔''(ص۸۸)

قائمؔ چاند پوری کے یہاں نئی نئی زمینوں ،خوش آہنگ اور بامعنی ترکیبوں ،زبان کی صفائی اور روانی،سلاست اور بے ساختگی حقیقی طور سے اپنے معاصرین سے الگ کرتی ہے۔وہ ممتاز ترین شعرا میرؔ،سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ سے کسی قدر کم نہ تھے،ان کی شاعری بہت جامع اور ہمہ گیر ہے۔قائمؔ اسی عہد کا شاعر ہے جس نے مرہٹوں اور جاٹوں کے مظالم دیکھے تھے جس نے اپنی شاعری میں اِس المیے سے متعلق بڑی دردمندی سے اپنے اشعار کو شعری قالب میں بیان کیا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے اِس مضمون میں میرؔ اور قائمؔ چاند پوری کے مابین اس طرح موازنہ کیا ہے:

قائمؔ اور میرؔ ایک ہی عہد کے شاعر ہیں،دونوں نے ایک ہی دور میں زندگی بسر کی،زمانے کی بے ثباتی ،خانہ جنگی ،احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی غارت گری کو دونوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی لیے دونوں کے شعری انداز اور رویوں اور شعری آہنگ میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔(ص۹۰/۹۱)

پروفیسر صدیقی نے میرؔ اور قائمؔ کے شعری نمونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں میں

شعری یکسانیت کو خوب واضح کیا ہے، موصوف کے مضمون کا ایک یہ اقتباس بہت اہم ہے:

> میرؔ، قائمؔ کے گھر کے قریب رہتے تھے اور اکثر و بیشتر ملاقات بھی ہوتی تھی اس سے پتا چلتا ہے کہ میرؔ اور قائمؔ کے ذاتی طور پر گہرے مراسم تھے۔ سوداؔ اور میرؔ کے درمیان معاصرانہ چشمک کی وجہ سے قائمؔ نے میر کی ہجو بھی لکھی تھی جو محض ایک حسن اتفاق کہا جا سکتا ہے قائمؔ، میرؔ سے عمر میں بڑے تھے لیکن دونوں اپنے اپنے فن میں ماہرانہ قدرت رکھتے تھے دونوں کے اشعار میں یک مضمونی اشعار خاصی تعداد میں مل جاتے ہے۔ سوداؔ جیسے مسلم الثبوت استاد کے ساتھ قائمؔ کا رویہ کیسا بھی ہو لیکن انہوں نے ہمیشہ شاگردوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور واجب التعظیم قرار دیا۔ قائمؔ ایک پرگو شاعر تھے اور فن سخنوری میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھی۔ احد علی یکتاؔ نے ''دستو الفصاحت'' میں لکھا ہے کہ قائمؔ تالیف کلیمات اور بندش الفاظ میں سوداؔ کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ محمد باقر حزیںؔ نے ان کا نام ''اکابر الشعرا'' کے ساتھ لیا ہے۔'' (ص۹۱ تا ۱۰۲)

قائمؔ چاندپوری سے متعلق پروفیسر صدیقی نے مزید لکھا ہے کہ قائمؔ کے ضرب المثل اشعار ازبر ہو جانے کی قوت رکھتے ہیں۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے، قلندرانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں لامرکزیت تھی، ہجو یہ انداز، زمانے سے بے نیازی اور بد دماغی قائمؔ کو قعر گمنامی کی طرف لے گئی۔ انہیں اردو شاعری میں وہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ مضمون کے آخیر میں پروفیسر صدیقی نے قائمؔ چاندپوری کے فن پاروں پر خاطر خواہ توجہ دلاتے ہوئے ان کے احتساب و اعتراف پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

❀❀

شاؔد عظیم آبادی - شخصیت اور سوانح

''اَسالیبِ فکر'' کا مطالعہ جیسے جیسے آگے بڑھا، راقم کی حیرت و استعجاب اور طبیعت متجسس ہوتی گئی کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے متذکرہ تصنیف میں کیسے کیسے گوہر نایاب جمع کر دیے ہیں ''شاؔد عظیم آبادی: شخصیت اور سوانح'' موصوف کی محنت شاقہ، بنظر تعمق اور ژرف بینی کا ہی نتیجہ ہے کہ زیر نظر مضمون میں شاؔد عظیم آبادی کے متعلقات، وابستگان اور شاؔد کی شخصیت سے متعلق باریک سے باریک پہلو پر ہوئی گفتگو، جذب صادق کی علامت معلوم ہوتی ہے:

> پانچ برس کی عمر ہی سے ان کی طبیعت تخلیقی رنگ دکھانے لگی تھی
> قوت ماخذہ مضبوط ہونے کی وجہ سے بے شمار عربی اور فارسی
> اشعار زبانی یاد تھے اور وہ انہیں بڑے لقلقہ کے ساتھ بلند آواز
> میں پڑھا کرتے تھے۔ اکثر اوقات ان کے بزرگ بھی ان
> سے شعر سننے کی فرمائش کر بیٹھتے۔ خاندان کے بزرگ شاؔد کی
> ذہانت اور ذکاوت سے بہت متاثر تھے۔ گھر میں علم و سخن کا
> ماحول تھا، یہاں تک کہ گھر کی خواتین بھی عربی صرف و نحو سے
> بخوبی واقف تھیں۔'' (ص ۱۰۹ تا ۱۱۰)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے شاؔد عظیم آبادی کے طرز حیات، سماجی و معاشرتی اقدار، ذمہ داریوں، انسان کی عظمت، حسی پہلوؤں اور نظریوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

وہ زندگی کے مقاصد اور نجی و سماجی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھے مذہبی اور اخلاقی اقدار پر ایقان نے اُن پر یہ آشکار کر دیا کہ زندگی خوشیوں کی آماجگاہ اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک کہ قلب ونظر میں کشادگی اور وسعت پیدا نہ ہو اور دوسروں کے مصائب و آلام نہ بن جائیں۔شادؔ عظیم آبادی کے یہاں انسانی عظمت کا احساس مستقبل کی بہتری کی خواہش اور زندگی کو خوش گوار اور متحرک دیکھنے کا ارمان تھا۔''

(ص ۱۱۱ تا ۱۱۲)

اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی مزید لکھتے ہیں:

شادؔ عظیم آبادی کی سیاسی ،ملّی اور قومی خدمات بھی کسی طرح کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔سیاسی سطح پر وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر اور میونسپل کمیشنر جیسے عہدوں پر فائز رہے۔۱۸۸۹ء میں انہیں آنریری مجسٹریٹ نامزد کیا گیا۔انہیں لیفٹینینٹ گورنر کی جانب سے ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازہ گیا۔انگریز اعلیٰ حکام کا اکثر ان کے گھر پر آمدورفت کا سلسلہ رہتا تھا۔انہوں نے موقوفی رسومات اور باہمی یگانگت کے لیے چند کمیٹیاں بھی قائم کی تھیں ،مثلاً نوروز کا سالانہ جلسہ (۱۸۷۵ء)،زاہدۃ المدارس اسکول اور انجمن مومنین کا قیام (۱۲۹۹ھ) (ص۱۱۲)

گو کہ پروفیسر صدیقی نے اپنی تحقیقی نقطۂ نظر سے شادؔ عظیم آبادی کو مسلک اور مذہبی عقائد کے اعتبار سے اہل تشیع لکھا ہے کہ ان کے دادھیال کے تمام افراد شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے نھیال میں شیعہ اور سنی دونوں مسلک کے افراد شامل تھے لیکن آپس میں بہت میل ملاپ محبت اور اتفاق تھا۔'' پروفیسر صدیقی اِسی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

شادؔ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا، اُن کی ایک ذاتی لائبریری تھی جس میں ہر مذہب و مسلک کی کتابیں اور شرحیں موجود تھیں تاریخ سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی، مختلف قوموں اور ممالک کی تاریخیں، اُن کے ذخیرۂ کتب میں موجود تھیں۔ تصوّف پر بھی اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اہلِ دل اور صاحب معرفت تھے، کوئی بھی عارفانہ شعر سن کر ان کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو بھر آتے، اُن کا دل ایک دردمند انسان کا دل تھا، دشمن کی بھی تکلیف سن کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔'' (ص۱۱۲تا۱۱۳)

حالانکہ دیگر محققین ادب نے شادؔ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ بتائی ہے لیکن پروفیسر صدیقی نے شادؔ عظیم آبادی کی نظم و نثر کی کل مطبوعہ کتب کی تعداد بتیس (۳۲) لکھی ہے جس کی تفصیل مع سن اشاعت و مرتب کے ''اسالیب فکر'' میں موجود ہے۔ شادؔ عظیم آبادی ایک تاریخ داں کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں، جس پر پروفیسر صدیق اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

۱۸۷۶ء میں جب "Prince of Wales" ہندوستان آیا تو اس نے شادؔ عظیم آبادی کی صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور ''بہار کی تاریخ'' لکھنے کی ذمہ داری شادؔ عظیم آبادی کے سپرد کی شادؔ نے تین جلدوں میں ''تاریخ بہار'' کو مکمل کیا لیکن سر فخر الدین خاں بہادر کی کاوشوں سے ۱۹۳۴ء میں اس کی صرف دو جلدیں شائع ہو سکیں۔'' (ص۱۱۳)

اردو شعر و ادب میں ہم عصر شخصیات کے مابین معاصرانہ چشمک یا اختلاف رائے ایک عام سی بات تھی۔ امور عامہ سے متعلق بہت سے قصّے اور واقعات ادبی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کا دور ہو یا آتشؔ اور ناسخ کا عہد یا غالبؔ و مومنؔ ہوں، بہتوں کے درمیان کسی نا کسی موقع پر معاصرانہ چشمک رہی ہے یا اختلاف رائے کے واقعات

پیش آئے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ نے ہجویات لکھ ڈالیں، آتشؔ اور ناسخؔ تو ایک دوسرے کی تہدیدات تک آ پہنچے تھے۔

شادؔ عظیم آبادی کے زمانہ میں چشمک زن کا ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں، پروفیسر صدیقی نے اس زاویہ سے بھی شادؔ عظیم آبادی کو دیکھا ہے:

> شادؔ عظیم آبادی کی ادبی اور تخلیقی زندگی کا آغاز مخالفتوں سے ہوا کیونکہ اُن کا معیار اپنے معاصرین اور عام شعرا سے کہیں زیادہ بلند تھا۔اُن کی ذکاوت اور طبع موزوں دیکھ کر معاصرین ان سے رشک وحسد پر اُتر آئے ،اس کی ایک وجہ شادؔ کی کتاب ''نوائے وطن'' کی اِشاعت بھی تھی۔اِس کتاب میں انہوں نے اہلِ عظیم آباد اور دیگر شرفا کی زبان ،تحریر وتقریر کی اصلاح سے متعلق کچھ مشورے دیے تھے۔''نوائے وطن'' کی اشاعت نے صوبۂ بہار میں کہرام مچادیا، یہ مخالفت صرف رسائل واخبارات مشاعروں اور محفلوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ذاتیات اور دشنام طرازی تک نوبت آ پہنچی،غرض کہ ہر سطح پر مخالفت کی گئی ،ان کی مخالفت میں ''اخبار الپنچ'' نکالا گیا جس میں اُن پر ہجویہ مضامین شائع ہوتے،طعن وتشنیع کی جاتی،چھپ چھپا کر لوگ گھر کی چہاردیواری کے اندر اخبار پھینک جاتے یا خفیہ طور پر اُن کی میز پر رکھ جاتے سینکڑوں گمنام خطوط گالی گلوچ سے لکھے ہوئے موصول ہوتے اِن حالات کو دیکھ کر اُن کے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ معافی نامہ کے طور پر ایک تحریر شائع کرادیں لیکن شادؔ نے قطعی طور پر انکار کردیا اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا،مثنوی

''چشم کوثر'' اور ''صورۃ الخیال'' کی دوسری اور تیسری جلد اُسی زمانے میں مکمل ہوئی۔ شادؔ کے کم وبیش نصف صدی اردو زبان و ادب کی خدمت کی اور موضوعات پر ایک لاکھ اشعار کہہ ڈالے۔ ابتدا سے آخر تک ان کے علم وفن کی خالفت ہوتی رہی ،ان کے مخالفین کا بیان ہے کہ جب کسی اخبار کے لیے ان کی ہجو لکھتے تو زبان کی تصحیح کے لیے ''نوائے وطن'' کی ہدایت پر عمل کرتے تھے اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مخالفین بھی ان کی علمی صلاحیتوں کا دل اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔''
(ص۱۱۳ تا ۱۲۵))

شادؔ عظیم آبادی نے لمبی عمر پائی ،ان کے شاگردوں ،دوست احباب اور چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جو شادؔ کی شخصیت اور شاعری کے مداح تھے بلکہ شادؔ کی دل سے توقیر بھی کرتے تھے شب بیداری ،کتب بینی اور ریاضت کی وجہ سے شادؔ کی طبیعت ناساز رہنے لگی ،زندگی کے آخری ایام بڑی کشمکش وسراسیمگی اور کسمپرسی میں بسر ہوئے ،جس پر پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

زندگی کے آخری دور میں انہیں وظیفہ یاب ہونا پڑا،سرکار کی جانب سے گھر کی مرمت کے لیے ہزار روپے، کتابوں کی اشاعت کے لیے نوسو روپے اور اخراجات کے لیے ایک ہزار روپے سالانہ پینشن مقرر ہوئی۔'' (ص ۱۱۶)

شب بیداری ،کتب بینی ،سخت ریاضت اور امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے نازک مزاج اور حسّاس ہوگئے تھے۔ زندگی کا آخری دور بڑی کشمکش اور سراسیمگی میں گزرا لیکن خاندانی جاہ وقار اور رکھ رکھاؤ میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اہلِ بہار نے ان کی عظمت کا اعتراف اور ان کے فن کی قدر نہیں کی اب

ان کے کلام کا احتساب اور مرثیہ کے تعین کا وقت آ گیا ہے
شاؔد کو اردو کا کلاسیکل شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔''(ص ۱۲۵)

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ شاؔد عظم آبادی کا بہت سا کلام تلف ہوا اور یہ کہ ان کا کلام غیر مرتب شکل میں بھی موجود ہے لیکن شاؔد کے کلام کا سرقہ بھی خوب کیا گیا۔ پروفیسر صدیقی نے ایسے کئی واقعات ومکتوب ''شاؔد کی کہانی شاؔد کی زبانی'' سے اخذ کیے ہیں۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

اتلاف اور سرقہ وافر تعداد میں شاؔد کا کلام مرتب اور غیر مرتب شکل میں موجود ہے جو ان کی عظمت کا اعتراف اور مرتبہ کے تعین کے لیے کافی ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں شاؔد نے ''ڈاکونامہ'' کے نام سے ایک رسالہ اپنے شاگردوں کی مدد سے تحریر کیا تھا۔ اس رسالے میں تلامذہ اور خصوصاً قیسؔ کی چوریوں اور سرقہ کی روداد درج ہے جو ان کے کلام، دواوین مراثی اور مثنویوں کا بیشتر حصہ اڑا لے گئے۔''(ص ۱۲۱)

شاؔد کی شاعری کا خاص وصف زبان وبیان کی صفائی وسادگی ہے۔ ان کے یہاں بندش میں روانی، چستی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جذبات کی پاکیزگی اور لطافت بھی شاؔد کی اہم خصوصیات ہیں۔ شاؔد کا شمار کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری لہجہ منفرد ہونے کے ساتھ موثر بھی ہے۔ انہوں نے قدیم شعرا کے لہجے کی پیروی بھی کی اور وہ اپنے جدید طرزِ اظہار سے بھی خوب واقف ہیں۔

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے شاؔد عظیم آبادی کے شعری نمونے پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اِظہار اس طرح کیا ہے:

شاؔد نے ابتدا میں قدیم اور روایتی رنگ اختیار کیا اور خواجہ وزیر کے رنگ میں بھی کچھ شعر کہے لیکن آخری دور کی شاعری میں ان پر لکھنوی اور دہلی کا مشترکہ اثر محسوس

کیا جا سکتا ہے۔انہوں نے اردو غزل میں سچّے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے ساتھ رنگ و آہنگ اور تازگی و توانائی پیدا کرنے کی کوشش کی ،اگر بوسہ کا مضمون استعمال کیا ہے تو بوسۂ آستاں یا بوسۂ قدم ہے۔اشاروں اشاروں میں حالات حاضرہ پر بھی تبصرہ ہے ،گمراہیوں اور خودغرضیوں کا بھی ذکر ہے۔وہ ایک پاک دل شاعر اور روشن ضمیر انسان تھے۔''

(ص۱۲۲)

شاؔد عظیم آبادی بڑے قادرالکلام شاعر تھے ۔انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل اور مرثیہ اُن کے خاص میدان تھے۔مرثیہ پر انہوں نے میر انیؔس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی بلکہ خیال و زبان میں انیؔس جیسی لطافت، چاشنی اور تاثیر پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ،اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا یہ تحقیقی اقتباس قابل غور ہے:

جہاں تک مرثیہ کا تعلق ہے ،ابتدا میں صنف مرثیہ میں طبع آزمائی کرنے میں دشواری پیش آئی لیکن میر انیؔس اور مرزا دبیؔر کی صحبتوں نے انہیں ایک اعلیٰ پائے کا مرثیہ گو بنا دیا میر انیؔس مجالس میں شرکت کرنے کی غرض سے تین سال تک مسلسل عظیم آباد تشریف لائے انہوں نے شاؔد کے مرثیوں پر اصلاح بھی دی ۔شاؔد نے بڑی محنت اور دلچسپی کے ساتھ مرثیہ کہے اور ہرمضمون پر مرثیہ قلم بند کیے ،مثلاً تمہیدی مضامین ،صبح کی کیفیت ،رخصت ،صف آرائی ،میدان جنگ کی حالت گرمی کی شدت، پیاس کی حدت ،میدان رزم،امام کی نماز اور اہل بیت کا بین وغیرہ۔''(ص۱۳)

مضمون کے اختتام پر پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں کہ ''عظیم آباد کی اِس عظیم المرتبت

شخصیت نے اپنا ادبی و تخلیقی سفر مکمل کیا اور ۸؍جنوری ۱۹۲۷ء کو اکیاسی سال کی عمر میں اِس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے، ان کی تجہیز و تدفین میں ہر مذہب و ملت اور عقیدے کے لوگ شریک ہوئے ،شاؔد منزل، حاجی گنج، پٹنہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی، انتقال کے وقت اُن کا اپنا ہی شعر، اُن کی زبان پر تھا۔''

آخر ہے عمر، ضیق میں ہے، دم بھی جان بھی
مردانہ باش ختم ہے یہ امتحاں بھی

❁❁

قاضی عبدالغفّار

قاضی عبدالغفار کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے افسانے، ڈرامے تنقید، اِنشا پردازی، شاعری اور ترجمہ نگاری سے ادب کو وسعت بخشی، ''تحریک نفاذ اُردو'' کی داغ بیل ڈالی اور تقریباً سات برس تک انجمن ترقی اُردو (دہلی) کے فعال و سرگرم سکریٹری رہے۔ آزادی ہند سے قبل کے فکشن نگاروں میں اُن کو ممتاز مقام حاصل ہے، لیکن اُن پر جس توجہ کی ضرورت تھی، وہ اُن کے حصے میں نہیں آئی۔ اِس لحاظ سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا یہ مضمون بہت اہم سمجھنا چاہیئے۔ مذکورہ مضمون میں قاضی عبدالغفّار کی زندگی اور اُن کی ادبی و صحافتی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے بلکہ پروفیسر صدیقی نے قاضی عبدالغفّار سے متعلق بعض و باالتحقیق ایسے نادرالوجود پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک کسی دیگر تحقیق میں عنقا ہیں اورا سکالرز کے لیے استفادہ اور دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ مضمون کی اہمیت وافادیت کا اندازہ صرف اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف اپنی تصنیف ''معروضات'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

قاضی عبدالغفّار کے سوانحی حالات فراہم کرنے میں ان کے
خانوادے کے معتبر اور برگذیدہ حضرات سے بنیادی معلومات
حاصل کر کے مقالہ تیار کرنے میں خاطر خواہ مدد لی گئی ہے۔
اِس سے قبل اب تک قاضی صاحب کے بارے میں اس نوع
کی معلومات پیش نہیں کی گئیں۔'' (دیباچہ معروضات)

پروفیسر صدیقی مضمون کی اِبتدا قاضی عبدالغفار کی تصنیف ''نقش فرنگ'' کے ایک اقتباس کی روشنی میں لکھتے ہیں:

> بیسویں صدی میں جن سیاسی اکابرین و عمائدین نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا، ان میں قاضی عبدالغفّار کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے ،صحافت اور سیاست ان کی دلچسپی کے دو اہم میدان تھے لیکن وہ بنیادی طور پر جرنلسٹ تھے۔انہوں نے اپنی ابتدائی صحافتی مشق کے دوران ''نیر عالم'' میں اپنی تحریریں شائع کرائیں لیکن ان کے صحافتی سفر کا باضابطہ آغاز ۱۹۱۲ء میں ''ہمدرد'' میں محمد علی جوہر کے ادبی معاون کی حیثیت سے ہوا۔'' (ص ۱۲۷)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے اِس مضمون میں قاضی عبدالغفار کے خانوادے سے متعلق خاطر خواہ معلومات افزا مواد جمع کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> قاضی عبدالغفّار مراد آباد کے ایک معزز اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے مراد آباد میں وہ تمبا کو والے محلے میں رہتے تھے ان کے والد قاضی ابرار احمد مراد آباد میں اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔حکومت نے انہیں ''خان بہادر'' کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ان کی والدہ سلمٰی بیگم ایک متدین خاتون تھیں جو اُنہیں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔اُن کی والدہ قاضی عبدالغفّار کو گھر پر پیارے میاں کہہ کر پکارتی تھیں قاضی عبدالغفّار کے دادا قاضی حامد علی سنبھل (اُتر پردیش) میں تحصیل دار تھے۔قاضی حامد علی کے والد کو بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ''قاضی'' کا خطاب ملا تھا۔انقلاب ۱۸۵۷ء کے

زمانے میں قاضی حامد علی کے مکان پر چند انگریز افسروں نے پناہ لی تھی۔غدر فرد ہونے کے بعد قاضی حامد علی کو صرف اس جرم کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی کہ انہوں نے انگریز افسروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن ان انگریز حکام نے بحفاظت انگلستان پہنچنے پر مراد آباد کے کلکٹر کو ایک خط ارسال کیا،اس خط میں قاضی حامد علی کے برتاؤ کی بڑی تعریف کی گئی تھی خط پڑھ کر مراد آباد کے انگریز کلکٹر کو قاضی حامد علی کو سزا دینے کا بہت افسوس ہوا۔'' (ص ۱۲۸)

چونکہ راقم الحروف کا تعلق بھی شہر مراد آباد سے ہے اور قاضی عبدالغفّار سے متعلق بہت سے تحقیقی مضامین نظر سے گزرے ہیں لیکن یہ اعتراف کرنے میں مضائقہ نہیں کہ قاضی عبدالغفّار کی زندگی سے متعلق یہ اہم پہلو ابھی تک نظروں سے اوجھل تھا، جسے پروفیسر صدیقی کی نگاہ تحقیق اِس طرح سامنے لاتی ہے:

۱۹۱۶ء میں قاضی عبدالغفّار سیاحت کے لیے پیرس ،لندن اور دیگر ممالک تشریف لے گئے، پیرس میں انہوں نے کپڑے کی ایک دکان کھولی اور پیرس ہی کی ایک خاتون کو دکان پر ملازم رکھ لیا پیرس میں جب ان کے پاس روپیہ ختم ہوگیا تو انہوں نے اپنے والد قاضی ابرار احمد کو ایک خط ارسال کیا جس میں پیرس میں خرچ کے لیے کچھ رقم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔خط پڑھ کر ان کے والد کو بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے محلّہ گلشہید میں واقع اپنے آبائی آم کے ایک وسیع باغ کو تین ہزار روپے میں فروخت کر کے وہ رقم قاضی عبدالغفّار کو پیرس روانہ کر دی لیکن تجارت میں نقصان ہوا اور چند ماہ بعد ہندوستان

واپس آ گئے۔'' (ص ۱۲۹)

عام طور پر قاضی عبدالغفار کا جب ذکر آتا ہے تو ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' جیسی معروف تصانیف اُبھر کر آتی ہیں اور ہم اکثر و بیشتر انہی میں مبہوت ہو جاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار ایک ممتاز ادیب ہونے کے ساتھ پائے کے صحافی بھی تھے، انہوں نے مولانا محمد علی جوہر سے وہ تمام گُر سیکھے جو صحافت کے معیار کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے لکھتے ہیں:

> ۱۹۳۴ء میں قاضی عبدالغفار نے حیدر آباد سے روزنامہ ''پیام'' جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اس دور کی صحافتی دنیا کا نمائندہ اخبار تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلکتہ سے ''جمہور'' اور دہلی سے ''الصباح'' جاری کیا تھا۔ یہ دونوں اخبار انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بن گئے۔'' (ص ۱۳۲)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے قاضی عبدالغفار کے تصنیفی سرمایہ میں ۱۴ر کتابوں کی تفصیل میں لکھا ہے:

> قاضی عبدالغفار کا تصنیفی سرمایہ ۱۴ر کتابوں پر مشتمل ہے جس میں ''نقش فرنگ'' پہلی کتاب ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اس کے بعد ''لیلیٰ کے خطوط'' ۱۹۲۴ء، مجنوں کی ڈائری، اُس نے کہا'' (ترجمہ) ''تین پیسے کی چھوکری، آثار جمال الدین افغان، مذہب اور دھرم، مشترکہ زبان، حیات اجمل، آثار ابولکلام آزاد، عجیب'' ۱۹۴۰ء اور ''دیوان شہدا'' شامل ہیں قاضی عبدالغفار کی معرکتہ الآرا تصنیف ''آثار جمال الدین افغانی'' ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔'' (ص ۱۳۳)

قاضی عبدالغفار کو سماجی اور سیاسی مسائل سے گہری دلچسپی تھی جس کا عکس ان کی ادبی

تحریروں میں نظر آتا ہے۔ان کی ادبی خوبیوں پر، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔آخیر میں وہ لکھتے ہیں کہ نثر میں قاضی عبدالغفار کا پیرایۂ بیان لطیف اور انداز بلیغ تھا۔عادات اور خصائل سے وہ ایک فرشتہ صفت انسان تھے مختصر اور جامع گفتگو کرنے کے عادی تھے۔خاندانی وجاہت اور زمیندارانہ شان، ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔مزاج میں حد درجہ تحمل اور استغنا تھا۔طبیعت اعتدال پسند اور مرنجاں مرنج واقع ہوئی تھی۔متذکرہ مضمون کو اُس کے مجموعی حجم کے حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم ''معروضات'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

قاضی عبدالغفار پر مقالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عام طور سے ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے۔میں اردو ادب میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تابناک مستقبل کی دعا مانگتا ہوں خدا میری دعا قبول کرے۔''(معروضات/ص ۹)

❁❁

اِقبال سہیلؔ کا فن

اعظم گڑھ کے ادبی اُفق پر ہمیشہ سے اہل علم وادب پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے علمی اور ادبی فن پارے دیرپا نقوش ہر دور کے اصحاب ذوق اور ارباب بصیرت کو خیرہ کیے رہتے ہیں۔ اُنہیں باکمال شخصیتوں میں اقبال سہیلؔ بھی قابل ذکر شخصیت تھے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس مقالے میں اقبال سہیلؔ کی سن ولادت، اُن کی تعلیم وتربیت، معمولات زندگی، پیشۂ وکالت، علامہ شبلی نعمانی سے وابستگی اور ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کی فارسی دانی کا استقصا کیا ہے نیز نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندوی، آل احمد سرور اور ضیاء الدین اصلاحیؔ جیسے مشاہیر ادب کے استدلالی اور بصیرت آمیز کلمات بھی نقل کیے ہیں۔ مجموعی طور پر زیر نظر مقالہ پروفیسر صدیقی کی فکری فعلیت کا ثمر ہے، موصوف لکھتے ہیں:

> اِقبال سہیلؔ اُردو کا ایک ایسا باکمال شاعر گزرا ہے جس نے خاموش رہ کر فن شاعری کو پروان چڑھایا اور اپنے فن کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ شاعری صرف دِلی جذبات ہی کا نام نہیں بلکہ فکر وفن کا بھی اظہار ہے۔ شاعری دراصل ذوقی اور وجدانی کیفیات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ قدرت کا ودیعت کیا ہوا ایک ایسا فن ہے جو کسی بھی تخلیق کار کو اوائل عمر ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ سہیلؔ کا مزاج بھی ابتدا ہی سے شاعرانہ تھا۔'' (ص ۱۳۵)

اقبال سہیلؔ کے قیام علی گڑھ کے دوران ان کی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہوا، یہاں رشید احمد صدیقی، ذاکر حسین اور دوسرے ہم مذاق اصحاب کا اجتماع، یونین کی محفلیں، مولانا حالیؔ حسرت موہانیؔ جیسے اہل کمال کی قربتوں نے ان کی شخصیت کو مزید نکھارنے کا کام کیا، اس حوالے سے پروفیسر صدیقی کے مقالے کا یہ اقتباس بہت اہم ہے:

> سہیلؔ کی شعری عظمت کا اعتراف سرزمین علی گڑھ کے ارباب حل وعقد نے بھی کیا۔ سلیمان ندوی اور شبلیؔ نے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں اور شعری اقدار کو تسلیم کیا، وہ اپنی جودت طبع ،ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے مقبول خاص وعام ہوئے ڈاکٹر اقبال نے ان کی فارسی دانی اور شاعرانہ فضل وکمال کی فیاضانہ تعریف کی، خواجہ کمال الدین نے سہیلؔ کے دلنشیں انداز پر دادِ تحسین دی۔'' (ص ۱۳۷)

یہ کہنا درست ہے کہ حالیؔ کے بعد چکبستؔ، علامہ اقبالؔ اور اقبال سہیلؔ نے غزل کو نئی سیاسی اور سماجی معنویت دی، ان کے یہاں حیات انسانی کی تعبیر وتفسیر اور تشکیل نو کا جذبہ ملتا ہے انہوں نے عام سخنوروں کی طرح ساقی کی بزم عیش میں دادِ تحسین نہیں دی بلکہ خود کو اجتماعی حقائق سے قریب تر کیا۔ اقبال سہیلؔ کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے پروفیسر صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

> سہیلؔ نے تغزل کی تمام صالح روایات اور عبارت، اشارت اور ادا کے تمام آداب برتے ہیں۔ ان کے اشعار کی عام شگفتگی میں غالبؔ اور مومنؔ کی سی لطیف تراکیب سے اور بھی حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کی فکر لالہ کار اور تازہ کار ہے جذباتیت کے مقابلے میں ان کے یہاں جوش بیان کا احساس ہوتا ہے۔ سہیلؔ کے انداز بیان میں ہمواری ہے، مگر اُکتا دینے والی یکسانیت نہیں ہے۔ وہ اپنے صاحبِ طرز متاخرین میں کسی

وَ سے پیچھے نہیں بلکہ اُن سے منفرد نظر آتے ہیں۔'' (ص ۱۳۹)

اقبال سہیلؔ نے جہاں ایک طرف اپنے پختہ ذہن اور قادر الکلامی کی وساطت سے غزل گوئی میں نئی معنویت پیدا کی تو انہوں نے خاصی تعداد میں منظوم خطوط بھی تحریر کیے اور سیاسی رہنماؤں پر نظمیں تخلیق کیں، جس پر پروفیسر صدیقی نے چند نظمیہ کلام کے نمونے نقل کرتے ہوئے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> اقبال سہیلؔ نے خاصی تعداد میں منظوم خطوط بھی لکھے، قطعات و رباعیات بھی لکھیں لیکن سہرے فی البدیہہ اور فرمائش پر ہی کہے سہیلؔ کی شاعری کا بیشتر حصہ نظموں ہی پر مشتمل ہے انہوں نے صنف نظم میں خوب طبع آزمائی کی اور مختلف موضوعات پر نظمیں کہیں ان میں قومی نظموں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ مثلاً نوائے وطن، ترانۂ وطن، صدائے سروش مبارباک آزادی، آزادیٔ ہند وغیرہ۔ علاوہ ازیں سہیلؔ نے سیاسی رہنماؤں پر بھی چند اہم نظمیں تخلیق کیں، مثال طور کے طور پر ''مرگ حیات آفریں، پنڈت جواہر لعل نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، گاندھی'' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔'' (ص ۱۴۱)

اِس خیال سے اتفاق کرنا گو کہ ذرا مشکل ہے کہ مذہبی (نعتیہ) شاعری کرتے وقت عموماً بے جا تعریفوں اور ثواب پر نظر رکھتے ہیں لیکن اردو اور بڑی حد تک محسنؔ کاکوری اور اقبال سہیلؔ کے علاوہ بھی چند شعرا مذہبی (نعتیہ) شاعری کے ذریعے عام شاعروں کے معیاروں سے آگے جانے کی مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد، زبان و بیان اور شکوہ بیان کے لحاظ سے اردو میں اعلیٰ شاعری کا نمونہ تو ہیں ہی، نعت کہنے کا پیمانہ بھی وضع کرتے ہیں۔ اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے زیر نظر مضمون میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

❀❀

اوپیرا نگاری

اوپیرا نگاری پر، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا یہ وقیع اور تحقیقی مضمون بظاہر مختصر ہے لیکن مجموعی طور پر بہت دلچسپ ہے ۔ یہ مضمون اوپیرا نگاری کا تجزیہ کرتا ہے جو پروفیسر صدیقی کی کوششوں کا مجتہدانہ نظر کا نتیجہ ہے اور طلبہ کے لیے مطلوبہ معلومات بھی فراہم کرتا ہے ۔ لہٰذا اپیرا نگاری کی ابتدا کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> اوپیرا منظوم ڈرامے کی ایک شکل ہے جس کے ابتدائی نمونے یونان میں ملتے ہیں ۔ یونان سے یہ صنف اٹلی، فرانس جرمنی روس آسٹریلیا اور برطانیہ ہوتی ہوئی امریکہ پہنچی اور مغربی ادبیات کے زیرِ اثر اردو میں رائج ہوگئی ۔ اردو میں اپیرا کا لفظ سب سے پہلے حافظ عبدالرحمٰن کے دیباچوں میں ملتا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن نے اپنے ڈراموں کے دیباچوں میں اِس صنف کو اوپیرا ناٹک قرار دیا ہے اوپیرا کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں رومانی، فکاہیہ اور سنجیدہ ۔ اوپیرا بڑی ریاضت طلب اور مشکل صنف تسلیم کی جاتی ہے ۔ ادبیات عالم میں اس کے نمونے بہت کم ملتے ہیں لیکن سنسکرت میں اوپیرائی ادب وافر تعداد میں موجود ہے ۔ اوپیرا کی تخلیق کے لیے موسیقی

اداکاری اور ڈرامے کے فن سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔
بیشتر تخلیق کار اس کے فن اور معیار پر پورے نہیں اترتے شاید
یہی وجہ ہے کہ اردو میں اوپیرا کے نمونے کمیاب ہیں۔''
(ص ۱۴۵)

اوپیرا، اپنی خصوصیت میں ایک Musical ڈرامے کا نام ہے جس میں ایک گانے اور آرکیسٹرا کے ذریعے Stage لگایا جاتا ہے اور کئی مختلف میوزیکل اجزا کے علاوہ، بصری عنصر مثلاً اداکاری، رقص، اسٹیج، ڈیزائن، ملبوسات، روشنی وغیرہ سے ایک مجموعی تاثر حاصل کیا جاتا ہے اوپیرا نگاری جیسے فن کی گہرائی میں اتر کر پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

اوپیرا نگاری کے حوالے سے چار چیزیں بطور خاص قابل توجہ
ہیں، لفظ، نغمہ، منظر نگاری اور اداکاری، اوپیرا میں گانے بجانے
رقص و سرور اور تھرکنے کے عمل کے ساتھ ساتھ اشعار میں
موزونیت، موسیقی اور نغمگی پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔''
(ص ۱۴۵)

اوپیرا کے اسٹیج کا موازنہ اس Screen سے کیا جاتا ہے، جس میں اسٹیج کے سامنے والے کنارے پر قائم تھیٹر کا پیش منظر کا آغاز (Proscenium Arch) تصویری فریم کا کردار ادا کرتا ہے، تاہم زور صرف افقی فراخی پر ہی نہیں بلکہ عمودی وسعت اور گہرائی پر بھی دیا جاتا ہے۔ تھیٹر کا پیش منظر کا پہلو تناسب عام طور پر تقریباً مربع ہوتا ہے۔ اِس کی تفصیل میں پروفیسر صدیقی مزید لکھتے ہیں:

اوپیرا کا اسٹیج سے بہت گہرا تعلق ہے، اِسے اسٹیج پر موسیقی کے
ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے خدوخال اسٹیج کے ذریعہ واضح
طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں، لیکن ریڈائی اوپیرا، اسٹیج اوپیرا سے
بالکل مختلف ہے۔ دورِ جدید میں ریڈائی اوپیرا کا ایک

خوبصورت نام غنائیہ بھی دیا گیا۔اوپیرا کی تعمیر وتشکیل میں
شاعری ،موسیقی اور ڈراما،تینوں اصناف نہایت متناسب
انداز میں کارفرما ہوتے ہیں لیکن اوپیرا میں نثر کا استعمال بھی کلی
طور پر ممنوع قرار نہیں دیا گیا،ایسی اوپیرا کی مثالیں موجود ہیں
جو مکمل طور پر منظوم نہیں ہیں۔''(ص ۱۴۶)

Proscenium(آگے کا پردہ) روایت کی شروعات پارسی تھیٹر سے ہوئی لیکن اُردو میں اوپیرا نگاری کی روایت ۱۹۵۳ء سے ملتی ہے۔اِس پر پروفیسر صدیقی نے مفصل روشنی ڈالی ہے:

انیسویں صدی تک ہندوستانی اوپیرا کا کوئی وجود نہیں ملتا البتہ
اوپیرا کی پہلی جھلک امانت کی ''اندرسبھا''(۱۹۵۳ء) میں ملتی
ہے غالبًا اسی لیے اردو میں اوپیرا کی روایت اندرسبھا سے
وابستہ ہے ابتدائی ڈراما نگار اوپیرا کے فن سے بخوبی واقف نہیں
تھے،ان کی یہ لاعلمی اوپیرا کی ترویج واشاعت میں حائل ثابت
ہوئی۔(ص ۱۴۶)

ہندوستان میں باضابطہ طور پر نشریات کا آغاز پہلی بار ۱۹۳۶ء میں ہوا،اور اِس طرح نشریاتی ادب کے نقوش آہستہ آہستہ ابھر کر سامنے آنے لگے تھے۔بہت کم وقت میں اس روایت نے اپنے اندر وسعت اور امکانات پیدا کر لیے،اِس کی ایک اہم وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ ریڈیو میں ابتدا سے ہی اردو کو کلیدی حیثیت حاصل تھی اور اردو میں ہی تمام نشریاتی مراکز سے پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے مضمون کا یہ اقتباس بہت اہم ہے:

اُردو میں ریڈیائی تخلیق کاروں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن
جن تخلیق کاروں نے اِس صنف میں طبع آزمائی کی اور اُسے جلا
بخشی اُن میں مختار صدیقی،سلام مچھلی شہری،ساغر نظامی،مخمور

جالندھری، قیصر قلندر، عمیق حنفی، شہاب جعفری، رفیق خاور عبدالعزیز رفعت سروش، کمار پاشی، تلوک چند کوثر، جعفر طاہر اور بشر نواز کے نام قابل ذکر ہیں۔''اندر سبھا'' کے بعد کے جو اوپیرا تخلیق کیے گئے، اُن میں سلام مچھلی شہری کا زیب النساء ایک اہم اوپیرا ہے۔ اِسے اردو کا پہلا اوپیرا تسلیم کیا جائے یا نہیں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے؟ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سلام مچھلی شہری نے اِس کی تخلیق اُس وقت کی جب شعرا اردو میں اس صنف کا رواج بہت کم تھا۔''زیب النساء'' کو سلام نے ایک عشقیہ واقعہ کی شکل دے کر نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔تاریخی حقائق کے پیش نظر اوپیرا کے تمام تر تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔سلام مچھلی شہری نے ''زیب النساء'' اور اُس کے والد اورنگ زیب کی مزاجی کیفیت کا تعارف خود کرانے کے بجائے شاعر کے ذریعہ کرایا ہے۔''

(ص ۱۴۷)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ساغر نظامی کے ''نہرو نامہ'' ''انار کلی'' اور رفعت سروش کے ''جہاں آراء'' اور ''شاہجہاں کا خواب'' قیصر قلندر کے اوپیراؤں کے مجموعہ ''ساز جمال'' اور کئی نامور اوپیرا نگاروں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اوپیرا کی تخلیق کے لیے مختلف بحروں میں شعر کہہ دینا ہی کافی نہیں بلکہ اوپیرا کے تقاضوں کے پیش نظر ہر شعر میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن میں نغمگی اور غنائیت کا بھرپور اظہار ہو۔اردو میں اس طرح کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے دور جدید کے اوپیرا نگار بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو لفظیات سے استفادہ کر رہے ہیں۔''

❀❀

اُردو شاعری میں پیکر تراشی

اُردو کی تمام شعری اصناف میں جو مقام و مرتبہ غزل کو ملا، وہ دوسری اصناف کو میسر نہیں آیا غزل جذب وخیال، متنوع موضوعات کا حیرت کدہ اور جہان معانی کا آئینہ خانہ ہوتا ہے، اس میں زندگی کی طرح وسعت پائی جاتی ہے، جس طرح زندگی اپنے اندر تمام رنگا رنگی، واقعات جذبات، تحریکیں، چہرے، نظریے اور رویے سمیٹ لینے پر قادر ہے، اسی طرح غزل تمام بوقلمونیوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی قدرت رکھتی ہے۔ جس طرح زندگی کا ارتقائی سفر بھی ایک تسلسل سے جاری رہتا ہے، زندگی کے بدلتے مناظر اور مظاہر غزل کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔

پیکر تراشی کے متعلق بہت سے مضامین ضبط تحریر آچکے ہیں لیکن پروفیسر صدیقی کا زیر نظر مقالہ اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے پیکر تراشی کے حوالے سے مقالے کی ابتدا لفظ ''پیکر'' کے لفظی معنی وساخت اور اس کے سیاق وسباق سے مدلل بحث کی ہے:

> امیجری انگریزی زبان کا لفظ ہے جو (Collective Image) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لغوی اعتبار سے (Image) کے معنی عکس، پرتو یا تصویر کے ہوتے ہیں اصطلاح ادب میں امیجری کا مطلب مرصع عبارت یا رنگین بیانی (Figurative Description) ہے امیجری لفظی (Literal) یا مجازی (Figuarative) مرصع بھی ہوسکتی

ہے۔ پیکر (I m a g e)علامت
(S y m b o l)تشبیہ (S i m i l e)اور
استعارہ(Metaphor)سب کے سب امیجری کو تشکیل
کرتے ہیں اسے لفظوں کے علامتی استعمال تکرار اور لفظی
تصویروں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جس سے کلام میں اثر اور
دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیکر مقید (ضیق) Tiedیا کسی حسی
تجربہ کا ٹھوس اظہار ہے۔''(ص۱۵۰)

پیکر تراشی کے حوالے یوسف حسین خاں نے لکھا ہے:

لفظوں میں تصور پوشیدہ ہوتے ہیں، ہر تصور اپنا ایک پس منظر
رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر ایک مخصوص گرد و پیش میں لے
جاتا ہے، جس سے بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں، ان
یادوں کا تعلق حافظہ اور شعور سے بھی ہوتا ہے۔''(ص۱۵۱)

لیکن پروفیسر صدیقی نے یوسف حسین خاں کے خیال سے تقریباً اختلاف کرتے ہوئے اپنا منطقی استدلال پیش کیا ہے:

یوسف حسین خاں امیجری کے ذیل میں حافظہ اور شعور سے
ماضی کے رشتوں کو بھی جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ
سب کچھ رومانی فضا کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ امیجری حسن و
رعنائی کا زیور ہے جو تصویر کشی اور منظر نگاری سے قریب تر
نظر آتی ہے۔ دراصل اردو میں پیکر تراشی ایک جدید طریق
مطالعہ ہے جس کے ذریعہ شاعری کو کلام کو سمجھنا اور اس کے
ذہن تک رسائی حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے شاعری کی
امیجری کا مطالعہ ہمیں خود شاعر کی ذات، اس کے ذہن اس

کے تجربات، دلچسپیاں اور اس کے گہرے خیالات کے قریب
تر پہنچا دیتا ہے۔اس فن کے ذریعہ بے روح اشیاء میں جان
پیدا کی جاسکتی ہے اور شاعری کی اندرونی کیفیات کا پتا
چلتا ہے۔'' (ص ۱۵۱)

مختلف اربابِ معنی اور نقد الشعر کی آراء سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاعری ہو یا نثر ادیب اپنے الفاظ اور تخیل کے ساتھ قاری کو وہ تصویر دکھا سکتا ہے جو اس کے ذہن میں ہوتی ہے اور اردو شاعری، بالخصوص غزل میں سراپا نگاری، پیکر تراشی کا رواج ہمیشہ سے ہی رہا ہے اور جہاں جمالیات رومانویت، حسن وعشق، محبوب کے ناز وانداز کا ذکر کثرت سے ہو وہاں پیکر تراشی کا عنصر بھی یقیناً بہت زیادہ ہوگا۔اِس پر، پروفیسر صدیقی نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

پیکر تراشی کا تخلیقی سرچشمہ ذہن کا فطری عمل ہے اور پیکر سازی
کا یہ عمل ہر انسان کے ذہن میں مختلف قسم کا ہوتا ہے کیونکہ مختلف
ذہنوں میں ایک ہی چیز کے مختلف نقوش ہو سکتے ہیں ۔عام
طور پر امیجری کو امیجینیشن اور امیجینیشن کو امیجری سمجھ لیا
جاتا ہے، جبکہ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن ان دونوں کا ایک
دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے ۔امیجینیشن خیالات کو
یکجا کر کے ذہن میں پیکروں کی تشکیل کرتی ہے۔(ص ۱۵۳)

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمثال نگاری، امیجری، پیکر تراشی ہو یا تخیل کی فضابندی اردو غزل جیسے جیسے اپنا ارتقائی سفر طے کرتی گئی، اِس میں تمثالیت کے نئے نئے ستارے چمکتے گئے اردو شعرا نے غزل میں صنائع اور تلمیحات کا وافر استعمال کیا۔اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے چند ایسے اشعار نقل کیے ہیں اور لکھتے ہیں:

اُردو شاعری میں پیکر تراشی کے نمونے تلاش کرنے پر ابتدا ہی
سے مل جاتے ہیں۔اردو کی شعری تاریخ پر نظر ڈالیں تو غزل گو

شعرا میں قلی قطب شاہ سے لے کر ولی، فراقی جرات، میر، غالب، ذوق، ظفر، حالی، مومن، آتش، ناسخ، جگر، جوش، فراق اور مجروح کے نام قابل ذکر ہیں۔(ص ۱۵۲)

وہ مزید لکھتے ہیں:

پیکر پردۂ ذہن پر خیال ہی کا عکس ہے، یہی عکس جب الفاظ کے ذریعہ ذہن کی پرتوں پر اُترتا ہے تو لفظی پیکر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور شعریات میں اُترتا ہے تو شعری پیکر کہلاتا ہے۔ اقبال کی نظمیں ''ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، ایک آرزو'' لفظی پیکر تراشی کے بہترین نمونے ہیں۔''

(ص ۱۵۵)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے دورِ جدید کے کئی ایسے شعرا کے کلام میں پیکر تراشی کے سراغ لگانے کی بھی کوشش کی ہے جنہوں نے مختلف قسم کی پیکر تراشی کو برتا ہے، نیز ان کے شعری نمونے بھی پیش کیے ہیں:

دورِ جدید میں چند ایسے شعرا کے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اردو نظم کو پیکر تراشی کے فن سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ مختلف قسم کی پیکر تراشی کو اپنی شاعری میں جگہ دی، ان میں احسان دانش اختر شیرانی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی شکیل بدایونی، اختر الایمان، احمد فراز، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض، سلام مچھلی شہری، جمیل مظہری، شاذ تمکنت، ساجدہ زیدی، محمود جالندھری، قیوم نظر، سکندر علی وجد، کیفی اعظمی، عمیق حنفی، مجاز لکھنوی، نادر کاکوروی، ابن انشاء قتیل شفائی، پروین شاکر، قاضی سلیم، عصمت

جاوید، بشر نواز، جاوید ناصر اور دیگر شعرا کے نام قابل ذکر ہیں۔'' (ص ۱۵۵)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مزید لکھتے ہیں کہ شاعری میں سارا کمال پیکر تراشی کا ہے۔کلام میں تمام اثر آفرینی اور دلکشی امیجری کی رہین منت ہے اگر شعر سے امیجری کو الگ کر دیا جائے تو شعر بے لطف اور بے مزہ ہو جائے گا۔پیکر تراشی ایک جدید فن ہے،اس کا مطالعہ ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے،جس کے ذریعہ ادب میں نئی شاخیں پھوٹ سکتی ہیں۔''

❀❀

ہندوستانی زبانوں کا مرکزی ادارہ
(سینٹرل اِنسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگو ویجز)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا زیرِ نظر مضمون بیش بہا معلومات فراہم کرتا ہے اور اِس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اِس کا عام اُردو داں طبقے کو کما حقہٗ علم نہیں ہے۔اس مضمون میں پروفیسر صدیقی نے بہت سی معلومات یکجا کردی ہیں۔

دراصل ہندوستانی زبانوں کا مرکزی ادارہ(CIIL)، ہندوستان کا ایک تحقیقی وتدریسی ادارہ ہے جو میسور میں واقع ہے۔اصلاً یہ ادارہ وزارت فروغ انسانی وسائل (حکومت ہند) کا ایک حصہ ہے جو ۱۷/جولائی ۱۹۶۹ء کو لسانیاتی تحقیق و تدریس کی بنیاد پر ہندوستانی زبانوں کے فروغ کو مدنظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا ہے۔مذکورہ ادارے کی وضاحت میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگو یجز کو ہندوستان میں لسانی یکجہتی کی بنیاد پر قائم کیا گیا جس کا اوّلین مقصد ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً اردو کی ترویج واشاعت اور فروغ قرار دینا ہے۔ابتدا ہی سے اس ادارے کو لسانی تحقیق و تدریس اور زبانوں کے فروغ کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں تشخص اور امتیاز حاصل رہا ہے۔ہندوستان کا یہ

> واحد ادارہ ہے جس کی بنیاد ثانوی زبانوں کی تدریس و تحقیق پر رکھی گئی اور جہاں Non Urdu Speaker یعنی ایسے اساتذہ کو اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہوتی، یوں بھی ثانوی زبان کے طور پر کسی بھی دوسری زبان کو سیکھنے یا پڑھنے سے لسان اور تہذیبی سطح پر نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ فہیم ادراک اور علم و فضل اور فکر میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرز فکر کو لسانی اور قومی یکجہتی کی علامت کہا جا سکتا ہے ہندوستانی زبانوں کا یہ مرکزی ادارہ اردو بحیثیت ثانوی زبان کی تدریس کے لیے خاطر خواہ مواقع فراہم کرتا ہے۔(ص ۱۵۹)

حالانکہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ''اسالیب فکر'' کے پیش لفظ میں یہ بات واضح طور پر بتا چکے ہیں کہ اردو زبان اپنی مقبولیت کی وجہ سے اپنا ایک Pan Character رکھتی ہے اور یہ امتیاز کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں، کیونکہ دیگر زبانوں کی طرح اردو کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے اس زبان کے پڑھنے اور بولنے والے ملک گیر سطح پائے جاتے ہیں۔انہوں نے مزید روشنی ڈالی ہے:

> جہاں تک اردو زبان کی مقبولیت کا سوال ہے، اردو ایک Pan Language کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے کیونکہ دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو کا کائی مخصوص علاقہ تصور نہیں کیا جاتا۔اس زبان کے پڑھنے اور بولنے والے ملک گیر سطح پر موجود ہیں۔اس لیے اردو کا ایک نیشنل کردار تسلیم کیا گیا ہے۔عالمی سطح پر اگر اردو کی مقبولیت اور قدر و قیمت کا جائزہ لیا جائے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی جس قدر زبانوں کے الفاظ اردو میں موجود ہیں، کسی دیگر زبان میں اتنی زبانوں کے

الفاظ موجود نہیں ہیں ۔اس طرح عالم گیر سطح پر اردو کا ایک
(Global Character) یعنی بین الاقوامی کردار ابھر کر
سامنے آتا ہے۔(ص ۱۵۹)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگو یجز کی کئی اہم کارگزاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگو یجز نہ صرف بیس ہندوستانی زبانوں کی ،جو آٹھویں شیڈول میں شامل ہیں تحقیق و تدریس کے میدان میں اعلیٰ سطح پر خدمات انجام دیتا ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی ۱۱۸ زبانیں جن میں ۸۰ قبائلی (Tribal Language) زبانیں بھی شامل ہیں ،ان کی بقا ،تحفظ اور مواد کی فراہمی کے لیے بھی سرگرم عمل ہے ۔اس ادارے کے اہم مقاصد میں دیگر ہندوستانی زبانوں اور خصوصاً اردو کو آن لائن کورسیز کی تدریس و ترجمہ سے جوڑنا نئی نسل کو ترجمہ کے ذریعہ معاصر زبانیں،ان کے ادب اور (Manuscriptorium) یعنی ذخیرۂ مخطوطات سے روشناس کرانا نیز اردو تدریس کے روایتی طریقۂ کار کو بہتر بنانے اور جدید تقاضوں کے مطابق ان کا اطلاق کرنا بھی شامل ہیں۔''(ص ۱۶۰)

مذکورہ ادارہ اپنے بہت سے امور کے لیے مختص ہے وہیں ،یہ اہتمام بھی کرتا ہے کہ جو لوگ زبان کی ساخت ،اس کی تہذیب اور تاریخی پس منظر کے بارے میں جاننے کے خواہشمند ہیں ان کے لیے چھ ہندوستانی زبانوں ،جن میں اردو بھی شامل ہے ،فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ آن لائن Learning Programme شروع کیا جاچکا ہے۔ نیز اس ادارے کا ترجمہ کا

شعبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

اِس ادارے میں ترجمہ کا شعبہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ،اِس شعبہ کے تحت شمالی ،مشرقی اور دیگر علاقائی زبانوں کا ترجمہ اردو اور مختلف ہندوستانی زبانوں میں کرانے کی کوششیں جاری ہیں ہندوستانی زبانوں میں ایک Translation ویب سائٹ بھی تیار کی جا چکی ہے۔''(ص۱۶۱)

پروفیسر صدیقی نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (CIIL) کے تحت لسانی تحقیق و ترجمہ سے متعلق دس بڑے شعبے/مراکز کا بالترتیب وتفصیل ذکر کیا ہے جو اِس امر کو یقینی بناتے ہیں کہ اعلیٰ سطح پر لسانی تحقیق و ترجمہ اور مختلف زبانوں کے ساتھ اُردو کو فروغ حاصل ہو۔ادارے کے تمام تر منصوبوں اور اغراض و مقاصد کے ذیل میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

اِس منصوبے کے مقاصد میں قومی آزمائشی خدمات کے معیار بند نظام کو ایک محرک عوامل کی حیثیت سے سانچے میں ڈھالنا،تعلیم کی مختلف سطحوں پر قابل نفاذ آموزگار کا اہلیت زبان معلوم کرنے کے لیے ترسیلی و پیائشی آلۂ جات کو فروغ دینا نیز مختلف مقاصد و سیاق کے تحت ان کے اصول مرتب کرنا کسی بھی فرد کی استعداد زبان معلوم کرنے کے لیے ماہیئت کے پیانے پر مبنی ایک کلیدی طریقۂ کار تخلیق کرنا اور اس کے ذریعہ ملک بھر میں تجدید امتحان کے لیے راہ ہموار کرنا شامل ہیں۔''(ص۱۶۲)

علاوہ ازیں پروفیسر صدیق نے مذکورہ ادارے کی پنج سالہ منصوبے کے خوش آئند نتیجوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اختتام پر ہندوستان کے پاس آزمائشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پچاس سے زائد علاقائی اکائیوں اور پچیس سے تیس ہزار تربیت

یافتہ افراد کے ساتھ آزمائشی خدمات کی نہ صرف ایک مکمل اور فعال صورت ہوگی بلکہ اِس منصوبے کی مدد سے اردو میں تعلیم کی سب ہی سطحوں پر نصابی آزمائشی ضروریات کی تکمیل ہوجائے گی۔''

❁❁

ہماچل میں اردو : اجمالی جائزہ

زیرنظر مقالہ غالباً اُن دنوں کی کاوش معلوم ہوتی ہے جب پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (حکومت ہند) کے شعبہ تدریس سے وابستہ تھے اور اعلیٰ سطح پر تحقیقی کاموں میں مصروف عمل تھے اور بحیثیت پرنسپل بھی موصوف نے خدمات انجام دیں۔

مقالہ میں پروفیسر صدیقی نے ہماچلی بولیوں کی تعداد بارہ بتائی ہے، ان میں اردو الفاظ کا کثرت سے استعمال ملتا ہے اور ساکنان ہماچل پردیش کے اُردو شعروادب سے منسلک شخصیات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے نیز معدودے چند شعرا جن میں چاند کلوی، کاہن سنگھ جمال، کنول نور پوری، سریش چند شوق، شباب للت، دھرم پال عاقل، کرم چند رسوا، کرشن کمار طور، سردار لال نشتر، ارمان شہابی، علنی و بھانا زلی کے نہ صرف شعری نمونے نقل کیے ہیں بلکہ ان پر مختصر اُنقد و تبصرے بھی تحریر کیے ہیں اور ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

علاوہ ازیں مقالہ میں ہماچل پردیش کے اردو فکشن نگاروں میں ہربنس لال گنڈوترہ، راج کمال، رتن سنگھ ہمیش، بہاری لال بہار، بخشی رام مسافر، سردار لال نشتر، پریم عالم، نرنجن تسلیم وغیرہ کے تخلیقی رجحانات اور طرز فکر و احساس پر اپنے خیالات رقم کیے ہیں اور طبع شدہ افسانوی مجموعوں ناولوں اور تنقیدی کارناموں پر خوب روشنی ڈالی:

> ایک اندازے کے مطابق ہماچل پردیش میں اب تک
> اشاعت شدہ تصانیف کی تعداد پانچ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے

> ان میں شعری مجموعے، مضامین، ناول افسانے، ڈرامے اور تذکرے وغیرہ شامل ہیں راجندر ناتھ رہبؔر نے ''آغوش'' کے نام سے شعرائے شملہ کا تذکرہ مرتب کیا تھا۔ علاوہ ازیں کرشن کمار طورؔ نے ''دریافت'' کے نام سے ہماچل کے اردو شعرا کا ایک تذکرہ مرتب کیا، جسے عرش صہبائی نے ''یہ جانے پہچانے لوگ'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ چاندؔ کلوی اور کرشن کمار طورؔ کے باہمی اشتراک سے ''ترتیب'' کے نام سے بھی ایک تذکرہ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ ''آبشار'' کے مرتب دھرم پال عاقلؔ اور ''لہو پکارے گا'' کے مرتب نو بہار صابرؔ ہیں۔ ان کی کتابوں میں ہماچل کے شعرا، ادبا اور اہم شخصیات اور ان کی نثری و شعری تخلیقات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر اُتم اہلووالیہ کا پی. ایچ. ڈی کا مقالہ ''ہماچل میں اردو'' کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔'' (ص ۱۷۴)

جہاں اردو شعر و ادب کا چراغ روشن ہو، وہاں اردو صحافت اور ادبی رسائل بھی سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر صدیقی نے ہماچل پردیش میں اردو صحافت اور ادبی رسائل کا سرسری جائزہ لینے کی بھی سعی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ہماچل پردیش میں اردو صحافت کی تاریخ بہت مختصر ہے، یہاں سے روزنامے تو کبھی شائع نہیں ہوئے البتہ ہفت روزہ ضرور شائع ہوتے رہے ہیں۔ پنڈت برہمانند، جو اردو صحافت میں دلچسپی رکھتے تھے، ان کی ادارت میں کانگڑہ سے ہفت روزہ ''کیلاش'' کا اجرا عمل میں آیا۔ ''ڈوگرہ سندیش'' روپ سنگھ

پھول کی ادارت میں جاری ہوا۔دھرم شالہ سے نریش چندر
سارتھی نے ''عکس'' شائع کیا۔بعد ازاں اسے بھی دیوناگری
رسم الخط میں تبدیل کر دیا گیا،ان اخبارات کی صحافت کا معیار
صوبائی سطح تک محدود رہا۔معدودے چند ادبی رسائل کے نام
بھی سامنے آتے ہیں مثلاً کانگڑہ کلچرل سوسائٹی کے تحت
۱۹۷۰ء میں ''ہم سخن'' کا اجرا عمل میں آیا،ان دنوں ہماچل
پردیش میں دو اہم ادبی جریدے شائع ہو رہے ہیں ان میں
''جدید فکر وفن'' بھاشا،کلا اور سنسکرت وبھاگ ،شملہ سے شائع
ہوتا ہے۔ایک اور سہ ماہی رسالہ ''سرسبز'' کرشن کمار طورؔ کی
ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔'' (ص ۱۷۴ تا ۱۷۵)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس معلومات افزا مقالے میں ہماچل پردیش میں وقتاً فوقتاً عمل میں آنے والی اردو ادبی تنظیموں کا مختصر جائزہ قلم بند کیا ہے،وہ خود بھی صوبائی سطح پر انجمن ترقی اردو ہند کے صدر کے عہدے پر فائز رہے،وہ لکھتے ہیں:

ہماچل پردیش میں ادبی انجمنیں اور ادارے بھی قائم ہوتے
رہے ہیں ۱۹۶۰ء میں جب ''بزمِ ادب شملہ'' کا قیام عمل میں آیا
تو ایک بار پھر ادبی محفلیں سرگرم عمل نظر آنے لگیں اُنہیں دنوں
سرداری لال نشترؔ کی سرپرستی میں ''بزم احسن'' قائم ہوئی یہ وہی
زمانہ تھا جب راجیش کمار رواج کی کی صدارت میں ''انجمن
ترقی اردو ہند'' کی ایک شاخ عالی جناب امین الدین خاں
صاحب (گورنر ریاست ہماچل پردیش) کی سرپرستی میں قائم
ہوئی۔۱۹۷۰ء میں کانگڑہ کلچرل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔بعد
ازاں خاکسار نے ''انجمن ترقی اردو'' (ہند) کی ایک شاخ

سولن میں قائم کی۔ان انجمنوں اور اداروں کے زیر اہتمام شملہ کے علاوہ ہماچل پردیش کے مختلف شہروں میں قومی سطح پر مشاعرے، سیمینار، کانفرنسیں اور ورکشاپ منعقد ہوتے رہتے ہیں۔"(ص۱۷۵)

پروفیسر صدیقی نے مقالے کے اختتام پر یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ریاست ہماچل پردیش میں سرکاری سطح پر بھاشا، کلا اور سنسکرتی وبھاگ، شملہ اور بھاشا اکادمی شملہ، اِن دونوں ہی اداروں میں دیگر زبانوں کے علاوہ ایک اُردو سیکشن بھی قائم کیا گیا ہے۔' مزید یہ کہ مقالے میں سفارشات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

❁❁

تحریک آزادی اور اُردو صحافت

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو صحافت نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔اس دور میں لوگ اپنے غصے اور حریت پسندانہ خیالات کا اظہار مختلف انداز میں کررہے تھے، یہ باغیانہ جنون انگریزوں کے ظلم و استبداد کے سبب روزافزوں بڑھتا جارہا تھا۔ برطانوی حکومت کی جارحانہ حکمت عملی کے سبب ملک کے دانشورں، عالموں،شاعروں،مفکروں اور وطن پرستوں نے یہ محسوس کرلیا کہ اب صبر کا باندھ ٹوٹ چکا ہے اور یہ لڑائی سب کو مل کر وسیع پیانے پر کرنا ہوگی،عوام میں اتحاد پیدا کیا جائے،ہم فکر لوگوں کی جماعت بنائی جائے ،اِس کا موثر ذریعہ صحافت ہی تھا۔صحافت کا سماج و معاشرے سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔لہٰذا اُن حریت پسندوں نے جهد البقاکے لیے اپنے جذبات واحساسات اور نوائے زیرلبی کو بلند کرنے کے لیے صحافت کا سہارا لیا،اکبرالہ آبادی نہایت خوبصورت انداز میں اس طرح نمائندگی کرتے ہیں:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہوتو اخبار نکالو

اِس نوع کے مضامین بھی ”تحریک آزادی اور اردو صحافت“”اسالیب فکر“ کا آخری مقالہ ہے اور خاصا طویل مقالہ ہے لیکن مقالے کی طوالت طبیعت پر اس لیے گراں نہیں گزرتی کہ یہ حد درجہ جامعیت و ہمہ گیری کا حامل ہے جو پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مجتہدانہ،فن کارانہ بصیرت اور مدبرانہ کاوشوں کا نتیجہ بھی۔حالانکہ تحریک آزادی اور اردو صحافت کے موضوع پر کافی

لکھا جا چکا ہے لیکن زیرِ نظر مقالہ اس اعتبار سے خاص اور اہم ہے کہ موصوف نے اُن اخبارات کو موضوع گفتگو بنایا ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جہادِ حریت میں نہ صرف کلیدی کردار ادا کیا بلکہ انگریزوں کے بے پناہ مظالم برداشت کیے اور اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے تھے۔ اِس سلسلے میں تقریباً پچاس اخبارات و جرائد اور اُن کے مدیروں کے نام، اُن کی اِشاعت کی فہرست کے ساتھ اخبارات و جرائد کی ادارتی خصوصیات و پالیسی، باغیانہ اداریوں اور لیڈنگ آرٹیکل کے چند اقتباسات، مستند حوالے، سیاسی اکابرین و عمائدین کے خیالات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> اخباروں کا طرزِ تحریر، زبان و بیان، لب و لہجہ براہ راست اور بالواسطہ طور پر انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ تلخ بھی ہوتا تھا۔ اردو اخباروں نے قومی شعور پیدا کرنے، عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے اور ان کے ارادوں کو مستحکم بنانے میں اہم اور مؤثر رول ادا کیا۔ اس طرح کے بہت سے اخبارات و رسائل ضبط کر لیے گئے اور ان کے مدیروں کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن انہوں نے ہنستے ہوئے ان تمام مظالم کو برداشت کیا اور ملک کے لیے جان کی بازی لگا دی۔'' (ص ۱۸۰)

اردو صحافت کے ابتدائی زمانے میں کوئی اخبار روزنامہ کی صورت میں شائع نہیں ہوتا تھا بلکہ عام طور پر ہفت روزہ، سہ روزہ یا ماہنامہ ہوتے تھے۔ ان اخباروں میں جو خبریں شائع ہوتی تھیں وہ عموماً انگریزی اخباروں سے لی جاتی تھیں۔ اردو اخبارات و جرائد کے محدود ذرائع کی طرح اُن کی تعداد اشاعت بھی محدود تھی، لیکن اس کے باوجود اردو اخبارات و جرائد نے جذبات برانگیختہ کرنے والے باغیانہ مضامین، نظمیں اور رباعیات تواتر سے شائع کیں۔ واضح رہے کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس مقالہ میں بالترتیب تقریباً اُن تمام اخبارات و جرائد کے ذیل

میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی اشاعت کا زمانہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ اُن سبھی کا ذکر من وعن حوالوں کے ساتھ نقل کر دیا جائے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

(۱) اخبار ''دلّی اردو اخبار''

اِس باب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اُن اخبارات و رسائل کو شامل کیا گیا ہے جو خالص سیاسی تھے اور جنہوں نے قومی شعور کو بیدار کرنے اور جنگ آزادی کے لیے زمین ہموار کرنے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا، اس دور کے اخبارات میں مولانا محمد باقر کا ''دلّی اردو اخبار'' ۱۸۳۶ء قابل ذکر ہے۔ ''دلّی اردو اخبار'' ۱۸۵۷ء میں بند ہوگیا، اس اخبار کو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نکالتے تھے۔ یہ اُس دور کا مقبول اخبار تھا لیکن یہ انگریزوں کے عتاب سے نہ بچ سکا۔''

پروفیسر صدیقی نے ''دلّی اردو اخبار'' کے حوالے سے امداد صابری کا ایک اہم اقتباس جو ''روح صحافت'' سے نقل کیا ہے، جس میں مولانا محمد باقر کی اس بات کی تعریف کی گئی ہے کہ انھوں نے نہ صرف اخبار کے صفحات آزادی کی لڑائی کو کامیاب بنانے کے لیے وقف کر دیے تھے بلکہ قلم کی جنگ کے علاوہ تلوار سے بھی انگریزوں سے جنگ لڑی اور جنگ کی ناکامی کی صورت میں انگریز قابض ہوگئے تو اخبار بند ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد باقری انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنے اور جامِ شہادت نوش کیا۔''

(۲) اخبار ''اودھ اخبار''

اُس دور کے اخباروں میں ''اودھ اخبار'' بھی ایک اہم اخبار تھا یہ اخبار منشی نول کشور کی ادارت میں لکھنؤ میں معروض وجود میں آیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار اپنے عہد کی ادبی تمدنی، معاشرتی اور

سیاسی تاریخ کی مستند اور باوقار دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ
اپنے عہد کے حاکموں پر نکتہ چینی کرتا تھا لیکن اپنی متانت کو
برقرار رکھتے ہوئے۔''اودھ اخبار'' نے ہندوستانیوں کے دلوں
میں قومی بیداری پیدا کی جس کا ثبوت اس کے مختلف شماروں
میں مل جاتا ہے۔''

''اخبار اودھ'' کے حوالے سے گارساد تاسی کا مختصر اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے جس میں گارساد تاسی نے ''اخبار اودھ'' کی ادارتی وطباعتی خصوصیات اور ضخامت کی تعریف کی گئی ہے۔''

(۳) اخبار''صادق الاخبار''

عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے میں چربی
والے کارتوسوں کا سانحہ بھی بڑا اہم ہے۔''صادق الاخبار''
کے ایک شمارے میں اس واقعہ سے متعلق خبر درج ذیل الفاظ
میں دی گئی ہے:

''ان دنوں تمام سپاہ سرکار نے نئے نئے کارتوسوں سے سرتابی
کرنا شروع کردی ہے۔ چنانچہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال
میں کچھ پلٹنیں بھر گئی تھیں، ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور
اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا... پلٹنیں گورکھا نمبر
۱۶، مقیم انبالہ نے بروقت قواعد عمل درآمد سے انکار
کردیا۔ از روئے ایک چھٹی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں
کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کی قواعد سے ٹکراتے ہیں اور
بجائے دانتوں کے، ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں۔ لوگوں
کے دل کا شک بالکل رفع نہیں ہوا۔''

پروفیسر صدیقی نے ''صادق الاخبار'' کے حوالے سے عتیق احمد صدیقی کی تحریر کا ایک

قتباس شامل کیا ہے جس میں عتیق احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ''دہلی کا سب سے زیادہ قابل ذکر اخبار ''صادق الاخبار'' تھا جس نے بغاوت کے جذبات کی تخم ریزی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اور جس نے بغاوت کے دوران باغیوں کے جذبات واحساسات کو ترجمانی کی تھی۔''

(۴) اخبار ''سلطان الاخبار''

اُس زمانہ کے اردو اخباروں کے مختلف شماروں میں غدر کے حالات میری نظروں سے گزر رہے ہیں ۔ یہ اخبارات نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، خدابخش لائبریری پٹنہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں موجود ہیں ان اخباروں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اوائل ہی سے بغاوت کے اثرات رونما ہونے لگے تھے اور اخباروں کا لب ولہجہ تند وتیز اور تلخ ہونے لگا تھا۔

''سلطان الاخبار'' اپنے ایک شمارے میں لکھتا ہے:

''ہمارا ملک اگر لیں گے تو جان دینے کا ارادہ کیا ہے خلافت عہد و پیماں اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سر میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے، جس دم معرکہ کارزار کی گرم بازاری ہوگی، دیکھ لینا کیسی ذلت وخواری ہوگی۔''

(۵) اخبار ''سحر سامری''

لکھنؤ سے ایک اخبار ''سحر سامری'' ۱۷رنومبر ۱۸۵۶ء کو جاری ہوا، یہ اخبار اپنے ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے شمارے میں اس دور کے حالات اور حکمرانوں کی بدانتظامی کا انکشاف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ان دنوں میں غلہ کی گرانی ہے، بے معشی نے برقماش کے

آدمی کا اطمینان کھو دیا، ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا، حاکم اس طرف عنان توجہ پھیرتا نہیں۔"

(۶) اخبار "کشف الاخبار"

"کشف الاخبار" بمبئی سے منشی امان علی نکالتے تھے، اس میں خبروں کے علاوہ مقامی واقعات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا اور حکومت کے مختلف محکموں کی بدعنوانیوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتا تھا۔'

(۷) اخبار "تاریخ بغاوتِ ہند"

"تاریخ بغاوت ہند" بھی اسی دور کا اخبار تھا جو ۱۸۵۹ء میں آگرہ سے جاری ہوا۔ اس سلسلہ وار ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں رونما ہونے والے جنگ آزادی کے واقعات شائع ہوتے تھے۔"

(۸) اخبار "شعلہ طور"

"شعلہ طور" بھی ایک اہم اخبار تھا۔ اس میں عام طور پر معاشرتی اور سیاسی واقعات کے بارے میں خبریں شائع ہوتی تھیں اور انقلاب پسندوں کے حالات درج ہوتے تھے جن میں انقلابیوں کے ساتھ زیادتی، ناانصافی اور ظلم و استبداد کو واضح طور پر بیان کیا جاتا تھا۔"

یہاں پروفیسر صدیقی نے اخبار "شعلۂ طور" کے اداریہ کا ایک طویل اقتباس کو سند بنایا ہے جس میں بہادر شاہ ظفر کے وزیر حکیم نواب ضیاء الدولہ کی داستان غم بیان کی گئی ہے۔"

(۹) اخبار "دبدبۂ سکندری"

غدر کے فرد ہونے کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائی کا سلسلہ شروع ہو گیا جو برسوں تک جاری رہا۔ اس پرشوب دور

میں یعنی ۱۸۶۶ء میں رام پور سے ''دبدبۂ سکندری'' منظر عام پر آیا یہ اخبار نواب قلب علی خاں (رامپور) کی ایما پر جاری کیا گیا تھا۔ اِس اخبار میں اُس دور کے ہنگاموں اور سیاسی معاملات کا ذکر ملتا ہے۔''

اخبار ''دبدبۂ سکندری'' کے بارے میں امداد صابری کی تحریر کا ایک اقتباس منسلک کیا گیا ہے جس میں امداد صابری نے انگریز حکومت کے خلاف افغانستان میں بغاوت، اور گاہے گاہے اس کی تفصیلات سے متعلق اشاعت کا ذکر کیا ہے۔''

(۱۰) اخبار ''آفتاب عالمتاب''

اُس دور کے اخبارات میں ایک اخبار ''آفتاب عالمتاب'' شائع ہوتا تھا، اِس اخبار کو امراؤ علی نے آگرہ سے ۱۸۶۱ء میں ہفت وار جاری کیا تھا۔ اس میں سیاسی خبروں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے حالات بھی درج ہوتے تھے۔''

(۱۱) ''اخبار عالم''

۱۸۷۱ء میں اخبار ''اخار عالم'' لاہور سے نکلنا شروع ہوا تھا یہ اخبار حکومت کی بدانتظامیوں پر نکتہ چینی کرتا تھا اور حاکموں کے جانب دارانہ رویے کی نقاب کشائی کرتا تھا۔''

(۱۲) اخبار ''اتالیق ہند''

''اتالیق ہند'' ۱۸۷۴ء میں لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا تھا یہ اخبار حکومت کو مشورے دیتا اور عوام میں ہندو مسلم اتحاد پید کرتا تھا۔''

(۱۳) اخبار ''تسنیم آگرہ''

یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو جاری ہوا تھا، اس اخبار کو منشی لال نکالتے

تھے ''تسنیم آگرہ'' میں اندرون ملک کے علاوہ غیر مما لک کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں، ہندوستانیوں کے سیاسی استحصال کے علاوہ انگریزوں نے اُن کے سماجی و مذہبی معاملات میں دخل انداز ہونا شروع کر دیا، ان کے ذہنوں کو بدلنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے گئے ،مسیحیت کی تبلیغ زور و شور سے شروع کر دی گئی ،انگریزوں کی اس حکومت نے ہندوستانیوں کے دلوں میں عام طور پر نفرت اور غم و غصہ پیدا کر دیا۔''

پروفیسر صدیقی نے اخبار ''تسنیم آگرہ'' کے ذیل میں اس کی ادارتی تحریر کی چند سطور بطورِ سند نقل کی ہیں، جس میں انجیل کی تقسیم اور اسکولوں میں روزمرہ کی بنیاد پر انجیل کی تعلیم کا ذکر ملتا ہے۔''

(۱۴) اخبار ''وکیل''

انیسویں صدی کے اوخر میں یعنی ۱۸۹۵ء میں امرتسر سے اخبار ''وکیل'' کا اجرا عمل میں آیا، اس کے مہتمم شیخ غلام محمد تھے ۔اس اخبار کی خدمات جن مدیروں نے یکے بعد دیگرے انجام دیں ،ان کے نام اس طرح ہیں مرزا جالبؔ دہلوی، مولوی انشاء اللہ خاں انشاؔ، مولوی عبداللہ منہاسؔ، مولوی محمد شجاع اللہ حکیم فیروزالدین۔اخبار ''وکیل'' کی زبان سلیس ہوتی تھی اس میں عصری حالات و واقعات پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔ملکی اور غیر ملکی دونوں طرح کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔''

پروفیسر صدیقی نے اخبار ''وکیل'' سے متعلق اپنے اس تحقیقی مقالے میں مولانا محمد علی جوہرؔ اور حسرت موہانیؔ کے خیالات بھی نقل کیے ہیں۔

(۱۵) اخبار ’’کرزن گزٹ‘‘

اُس دور کے اخباروں میں ’’کرزن گزٹ‘‘ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ’’کرزن گزٹ‘‘ ۱۹۰۰ء میں کلاں محل دہلی سے ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا تھا جو بیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔اس کے مالک و مدیر مرزا حیرت ایک حق پسند اور بیباک صحافی تھے حکومت کے کاسہ لیسوں پر نکتہ چینی کرتے، نیز حکومت کی ناانصافیوں اور بد اعمالیوں کی نقاب کشائی کرتے تھے۔اس کے مدیر کو باغیانہ مضامین لکھنے کی پاداش میں بڑی صوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن ان کی روش میں کوئی فرق نہیں آیا۔‘‘

بیسوی صدی کی ہندوستانی صحافت نے بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا، اس دور کی صحافت کی خصوصیت یہ تھی کہ ملکی و غیر ملکی صحافت کے درمیان خط امتیاز قائم کیا، اس عہد کی ابتدائی اردو صحافت جس نے عوام میں اخبار بینی کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

بیسویں صدی کے اوائل میں نئی قومی تحریکوں نے جنم لیا، بنگال کی تقسیم مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کا قیام بھی اسی دور میں عمل میں آیا، دوسری دہائی میں انڈین نیشنل کانگریس میں کچھ گرمی کے آثار نظر آنے لگے پہلی جنگ عظیم، ہوم رول، لیگ خلافت تحریک جیسی تحریکوں نے جنم لیا، ان تمام سیاسی سرگرمیوں کے اثرات اور صحافت نے بھی براہ راست طور پر قبول کیے۔‘‘

(۱۶) اخبار ’’وطن‘‘

بیسویں صدی کی ابتدا میں نکلنے والے اخباروں میں ’’وطن‘‘ اخبار کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں لاہور

سے جاری ہوا ،اس کے مالک اور ایڈیٹر مولوی انشاء تھے ابتدا میں اخبار مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حقوق کے تحفظ سے بحث کرتا تھا،البتہ ۱۹۰۷ء سے اس کی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور اس میں تحریک آزادی کے سلسلے میں مضامین شائع ہونے لگے جو حکومت کے خلاف تھے جس کے نتیجے میں ۱۹۳۰ء میں ''وطن'' اخبار بند ہوگیا۔

(۱۷) اخبار ''ترقی''

''ترقی'' ۱۹۰۲ء میں لاہور سے شائع ہوا،اس میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کی کاروائیاں چھپتی تھیں۔''

(۱۸) ماہنامہ ''زمانہ''

ماہنامہ ''زمانہ'' ۱۹۰۷ء میں کانپور سے جاری ہوا،اس کے مدیر شیوبرت لال تھے۔اس میں سیاست ،معاشیات،مذہبیات اخلاقیات ،نفسیات ،لسانیات سے متعلق مضامین اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔اس کا ایک کالم ''رفتار زمانہ'' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔''

پروفیسر صدیقی نے ماہنامہ ''زمانہ'' کے جنوری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں شائع ،دو اہم اقتباس بھی نقل کیے ہیں جن ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں کا ناروا سلوک اور سرکاری سطح پر تشدد کا ذکر ملتا ہے۔''

(۱۹) اخبار ''زمیندار''

''زمیندار'' جون ۱۹۰۹ء میں لاہور سے مولانا سراج الدین نے جاری کیا تھا۔۱۹۰۹ء میں ہی مولانا سراج الدین کی وفات ہوگئی اور ان کے فرزند ظفرعلی خاں نے اِس کو جاری

رکھا ''زمیندار'' عوام میں بہت مقبول تھا۔''

پروفیسر صدیقی نے اِس مقالے میں روزنامہ ''زمیندار'' کے بارے میں خورشید عبدالسلام اور معین عقیل کے کلمات بھی نقل کیے ہیں، جن میں عبداللہ العمادی ،نصراللہ خاں عزیز، عبدالحمید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں مکیش، چراغ حسن حسرت، حاجی لق لق کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲۰) اخبار ''مخبر عالم''

''مخبر عالم'' ۸؍جون ۱۹۰۳ء کو مراد آباد سے شائع ہوا ،اس کا تیسرا شمارہ ''مخبر عالم'' اور ''رحمت عالم'' کے نام شائع ہوا، اس اخبار نے انگریزوں کی مسیحی تبلیغ کی سخت مخالفت کی۔''

اخبار ''مخبر عالم'' کے ۳۰؍اگست ۱۹۰۳ء کے شمارے کی ادارتی تحریر کا وہ اقتباس بھی شامل کیا ہے جس میں ریاست جے پور میں عیسائی پادریوں کے دو مشن اسکول کے قیام اور عیسائی عورتوں کا گھروں میں جا کر عیسائیت کی تعلیم دینا اور عیسائی پادریوں کا آزادانہ وعظ کرنے کا ذکر آیا ہے۔

(۲۱) رسالہ ''اُردوئے معلیٰ''

تحریک آزادی کے عظیم مجاہد، سیاستداں اور اعلیٰ پائے کے تخلیق کار صحافی فضل الحسن حسرتؔ موہانی کی ادارت میں رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' جولائی ۱۹۰۳ء سے نکلنا شروع ہوا جو اڑتالیس سے چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔اس ادارہ میں اردو کے نامور شعرا کے علاوہ ادبی ،تاریخی ،تنقیدی اور سیاسی مضامین بھی بڑی بیباکی سے لکھے جاتے تھے ۔حکومت پر اعتراض کرنا اور مسلمانوں کو کانگریز میں شمولیت کی تلقین کرنا اس کا شعار تھا۔ یہ اخبار کمیونسٹ پارٹی اور کانگریز کا حامی

تھا۔اس وقت وقوع پزیر ہونے والی تحریکوں میں حصہ لیتا تھا۔''

''اردوئے معلیٰ'' کے ذیل میں فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں اُس مضمون جو''سدیشی تحریک'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا؛ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے جس میں ''سدیشی تحریک'' کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔

(۲۲) اخبار''ہندوستانی''

اس دور کے اخباروں میں ''ہندوستانی'' بھی قابل ذکر ہے ''ہندوستانی'' ۲۶/اگست ۱۹۰۴ء کو لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا، یہ اخبار انگریزوں کا سخت مخالف تھا،جس دور میں ہندوستانیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور خاص کر افریقہ اور امریکہ میں ان کی بڑی تضحیک کی جاتی تھی۔''

پروفیسر صدیقی نے اِس مقالے میں اخبار''ہندوستانی'' میں شائع ہوئی اُس تحریر کو نقل کیا ہے جس میں ہندوستانیوں کے ساتھ افریقہ، یورپ سے نکالے جانے نیز ان کی تضحیک و استہزاء اور ناروا سلوک پر شدید احتجاج کیا گیا ہے۔

(۲۳) اخبار''آزاد''

''آزاد' اخبار جنوری ۱۹۰۷ء کو لاہور سے نکلنا شروع ہوا، اس کے مدیر بشن نارائن آزادؔ تھے۔ اس اخبار کا نصب العین ہندوستانیوں میں آزادی کی تبلیغ کرنا تھا۔جس وت انگریز ہندوستانیوں پر مظالم توڑ رہے تھے، یہ اخبار بڑی آب وتاب کے ساتھ نکل رہا تھا اور انگریزں کے سفاکانہ مظالم کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔''

پروفیسر صدیقی نے''آزاد' اخبار کے ۱۹۰۶ء کے شمارے کا وہ طویل اقتباس بھی نقل کیا ہے جس میں انگریزوں کے ظلم وتشدد اور حریت پسندوں کی ٹھوکروں سے تذلیل کرنے کا ذکر

ہے۔اقتباس میں اس عزم کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں پر جتنی سختیاں کی جائیں گی ،اُتنی ہی نفرت گوروں کے لیے بڑھتی جائے گی۔

(۲۴) اخبار ''ہند''

''ہند'' ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ سے ہفتہ وار شائع ہوا،منشی دوار کا پرشاد افق لکھنوی اس کے ایڈیٹر تھے۔یہ اخبار سودیشی تحریک کا حامی تھا،حکومت پر نکتہ چینی کرتا اور سخت مخالفت کرتا،اس اخبار پر پابندی لگادی گئی اور یہ جلد بند ہوگیا۔''

(۲۵) اخبار ''انڈیا''

''انڈیا'' گوجرانوالہ سے ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا،حق پرست اور بیباک اخبار تھا۔اس کے مدیر دیناناتھ پر باغی ہونے کا الزام لگا کر ضبط کرلیا نیز مقدمات چلائے گئے کیونکہ اس میں انقلابی مضامین شائع ہوتے تھے۔''

(۲۶) اخبار ''آفتاب''

''آفتاب'' ۱۹۰۷ء میں ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا،اکے مالک اور ایڈیٹر حیدر رضا دہلوی تھے۔اس میں حب الوطنی سے بھرپور مضامین شائع ہوتے تھے۔یہ اخبار ڈیڑھ سال کے بعد بند ہوگیا۔''

(۲۷) اخبار ''سوراجیہ''

''سوراجیہ'' ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔یہ حریت پسند اخبار تھا اور بغاوت کی تلقین کرتا تھا۔اس کے مدیر کو جیل بھیج دیا گیا اور اس طرح یہ بھی ۱۹۱۰ء میں بند ہوگیا۔''

(۲۸) اخبار ''انقلاب''

ہفتہ وار ''انقلاب'' ۱۹۰۸ء میں معروض وجود میں آیا، یہ بھی

سودیشی تحریک کی حمایت میں لکھتا تھا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد بیسویں صدی کے آغاز میں ایک انقلابی صحافی کے طور پر اردو صحافت کے افق پر ظاہر ہوئے اور اردو صحافت میں نئے امکانات کو روشن کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔''الہلال والبلاغ'' سے پہلے کا زمانہ اور دوسرا ''الہلال والبلاغ'' کا زمانہ، پہلا دور جس میں انہوں نے ''نیرنگ خیال'' اور ''لسان الصدق'' جاری کیا تھا اور مختلف اخبارات سے بھی وابستہ تھے۔''نیرنگ خیال'' ایک ادبی پرچہ تھا جس میں قصائد اور شعری کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے سائنٹفک طریقۂ تحقیق سے مقالے میں روح پھونک دی ہے:

> ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے وہ ایک صاحبِ طرز ادیب، محقق اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب صحافی بھی تھے۔ اوائل عمری سے ہی مضمون نویسی میں شغف رکھتے تھے، اخبار بینی نے ان کے اس مذاق کو اور بھی جلا بخشی اسی مذاق نے انہیں ایک کامیاب نثر نگار اور صحافی بنا دیا، اردو صحافت میں روبروز ان کی دلچسپی بڑھتی گئی، نتیجے کے طور پر مولانا نے ایک ادبی گلدستہ ''نیرنگ خیال'' کلکتہ سے جاری کیا۔ ''الصباح'' اور ''الندوہ'' کی ادارت کے ساتھ ''مخزن'' اور مختلف جرائد اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے۔ مولانا نے ''تحفۂ محمدیہ'' اور ''خدنگ نظر'' کو بھی مرتب کیا ۱۹۰۳ء میں ''الصدق'' جاری کیا ''وکیل'' اور ''دارالسطنت'' کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اخبار ''الہلا'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۲۹) اخبار ''الہلال''

صحافت میں مولانا ابولکام آزاد کا اہم ترین کارنامہ 'الہلال' ہے۔اس اخبار کا اجرا ۱۳/جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا، یہ ہفتہ روزہ اخبار اردو ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔اس میں مذہبی سیاسی تاریخی، ادبی، سوانحی مضامین نیز جغرافیہ سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔۱۶/نومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار روپے کی پہلی ضمانت ضبط کر لی، اِس طرح ۱۴/اور ۱۷/اکتوبر کا مشترکہ شمارہ بھی ضبط کر لیا گیا اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸/نومبر کی اشاعت کے بعد ''الہلال'' بند ہو گیا، ۱۰ /جون ۱۹۲۷ء کو ''الہلال'' دوبارہ جاری ہوا اور ۹/دسمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت کے بعد ''الہلال'' بالکل بند ہو گیا۔''

اخبار ''الہلال'' کے ذیل میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ۶/نومبر ۱۹۱۳ء کے شمارے سے مولانا کی ولولہ انگیز تحریر کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے جس میں مولانا افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کے مصائب اور ان کے ساتھ زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ساتھ ہی پروفیسر صدیقی نے امداد صابری کی تحریر (بحوالہ تاریخ صحافت) کا ایک مختصر اقتباس بھی شامل کیا ہے جس میں ''الہلال'' کی ستائش کی ہے بلکہ اُسے حریت پسند عوام کی جدوجہد کا جز قرار دیا ہے۔

ملک وملت کے لیے مولانا محمد علی جوہر کی ہمہ جہت خدمات نا قابل فراموش ہیں، ان کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی غیر معمولی ذکاوت اور ذہنی بلندی کا ہر کوئی معترف ہے۔وہ بیک وقت پایہ کے انشاپرداز، ادیب، شعلہ بار خطیب، جنگ آزادی کے سپاہی، تحریک خلافت کے قائد اور ایک کامیاب صحافی تھے۔پروفیسر صدیقی اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں:

(۳۰) اخبار ''ہمدرد''

مولانا محمد علی جوہر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے، وہ سچے مجاہد آزادی اور محبِّ وطن تھے۔تحریک آزادی کی تبلیغ کے لیے اُنہوں نے ایک خبار ''ہمدرد'' کے نام سے جاری کیا، یہ اخبار ۲۳رفروری ۱۹۱۳ءکوکوچہ چیلان دہلی سے ایک روزنامہ کی شکل میں جاری ہوا تھا۔مولانا محمد علی جوہر کی فرمائش پر مولانا حالؔی نے ''ہمدرد'' کے اجرا کے موقع پر ایک رباعی کہی تھی جس سے اس اخبار کی غرض و غایت کا اندازہ ہوتا ہے ہمدرد کی فائلیں ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں موجود ہیں فائیلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا سے آخر تک مولانا محمد علی جوہؔر آزادیٔ وطن کے لیے لکھتے رہے۔''

اخبار ''ہمدرد'' کے حوالے سے پروفیسر صدیقی نے ۱۷ردسمبر ۱۹۱۳ءکے شمارے کا ایک بڑا اہم اقتباس نقل کیا ہے، جس میں مولانا محمد علی جوہؔر نے مسلمانوں میں آزادی کا شہرہ اور وفورِ شوق سے متعلق گفتگو کی ہے۔علاوہ ازیں پروفیسر صدیقی نے اسی مقالے میں مولانا محمد علی جوہؔر کی تحریر کا ایک اور اقتباس شامل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد جوہؔر کانگریس کے حامی تھے اور عوام کو کانگریس پارٹی میں شمولیت کی تلقین بھی کرتے تھے۔

(۳۱) اخبار ''البلاغ''

''الہلال'' کے بند ہوجانے کے بعد ۱۲رنومبر ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار ''البلاغ'' کلکتہ سے جاری کیا لیکن یہ بیک وقت دوشماروں پر مشتمل ہوتا تھا اور پندرہ روزہ نکلتا تھا۔اپریل ۱۹۱۶ءکو صوبہ بدر ہوجانے کی وجہ سے ۱۷راور ۳۱رمارچ ۱۹۱۶ء کے بعد ''البلاغ'' بند ہوگیا۔''البلاغ'' کی

زبان بڑی صاف ستھری اور جامع ہوتی تھی۔ یہ اخبار بھی اپنے
عہد کی سیاسی تحریکوں اور حالات وکوائف کا ترجمان تھا۔‘‘

صدائے حریت محض ہندوستان میں ہی نہیں گونج رہی تھی بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آزادی کے شور انگیز نغمے گنگنائے جا رہے تھے جس کی مثال اخبار ’’غدر‘‘ ہے۔ یہ آزادی سے قبل شمالی امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کا حریت پسند اخبار تھا، جس کے بارے میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

(۳۲) اخبار ’’غدر‘‘

اخبار ’’غدر‘‘ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو کیلیفورنیا سے جاری ہوا، یہ اردو
ہندی مراٹھی اور گورمکھی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر
رام چندر اور معاون ایڈیٹر برکت اللہ بھوپالی تھے۔ یہ ایک
انقلابی ہفتہ وار اخبار تھا جو ہندی ایسوسی ایشن آف ینگ کاسٹ
کا آرگن تھا، کچھ عرصہ بعد یہ ایسوسی ایشن سان فرانسسکو منتقل
ہوگئی، تو اخبار کا دفتر بھی منتقل ہو گیا، اس ایسوسی ایشن کا نام
غدر پارٹی تھا۔ غدر پارٹی کے روح رواں اور اخبار ’’غدر‘‘ کے
بانی لالہ ہردیال تھے۔ یہ اخبار انگریز حکومت کی شدت سے
مخالفت کرتا تھا، عوام کو غدر پارٹی میں شامل ہونے اور تحریکوں
میں حصہ لینے کی تلقین کرتا تھا۔ غدر پارٹی کے رضا کار اس کو عام
سڑکوں اور بازاروں میں تقسیم کرتے، نیز غیر ممالک میں رہنے
والے ہندوستانیوں کو ہندوستان آنے کی تلقین کرتے۔‘‘

پروفیسر صدیقی نے اخبار ’’غدر‘‘ کے اداریہ سے ایک اہم اقتباس کو مقالے کا حصہ بنایا ہے جس کی قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’غدر‘‘ نے غیر ممالک میں بسنے والے انڈینز کو اپنے وطن واپس آنے، نیز غاصبین کو قتل، خوفزدہ اور مار بھگانے پر بہت زور دیا ہے۔

(۳۳) اخبار ’’ہمدم‘‘

اس دور کا ایک اور اخبار ’’ہمدم‘‘ تھا، یہ اخبار یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ سے جاری ہوا۔ ایڈیٹر سید جالب دہلوی تھے ،اس اخبار نے ایسے دور میں تحریک آزادی کی حمایت میں آواز بلند کی جب ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ انگریزوں کی طرف سے سخت قانون نافذ کیے جا رہے تھے، ذرا ذرا سی بات پر اخباروں کی ضمانتیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ اس اخبار کی فائلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خلافت تحریک سے متعلق زیادہ خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اخبار ’’ہمدم‘‘ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ تحریک آزاد کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی

(۳۴) اخبار ’’رہنما‘‘

پہلی جنگ عظیم سے قبل انگریزوں نے ہندوستانیوں سے جو وعدے کیے تھے، پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان کو پورا نہیں کیا مزید یہ کہ ہندوستانیوں کے استحصال کے لیے ’’رولٹ ایکٹ‘‘ جیسے قوانین نافذ کیے ،اس دور کے ایک اور اخبار ’’رہنما‘‘ نے ’’رولٹ ایکٹ‘‘ کی سخت مخالفت کی، یہ اخبار ۱۹۱۸ء میں محلّہ مفتی ٹولہ، مرادآباد سے پندرہ روزہ نکلنا شروع ہوا، اور کچھ عرصہ بعد ہفتہ وار ہوگیا۔ اس کے مدیر محمد اشفاق حسین صدیقی مرادآبادی تھے۔ اس میں سیاسی مضامین ہوتے تھے، بالخصوص پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے مظالم کا ذکر، اس کے مختلف شماروں میں مل جاتا ہے۔‘‘

(۳۵) اخبار ''پرتاپ''

اخبار ''پرتاپ'' ۳۰ر مارچ ۱۹۱۹ء کو لاہور سے جاری ہوا، یہ روزنامہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ''پرتاپ'' کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن چندر تھے، جب ''پرتاپ'' معرض وجود میں آیا، اُس وقت پنجاب میں سیاسی بے چینی کا دور تھا، لہٰذا ''پرتاپ'' نے قومی نظریات کی حمایت کرنا شروع کر دی ۱۸ر اپریل ۱۹۱۹ء کو مہاشہ کرشن چندر کو گرفتار کر لیا گیا، مہاشہ کی گرفتاری کے بعد ''پرتاپ'' بند ہو گیا ۱۹۲۰ میں مہاشہ جی جیل سے واپس آئے تو ''پرتاپ'' بھی دوبارہ جاری ہو گیا۔''

(۳۶) اخبار ''سیاست''

۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت کا آغاز ہوا، اسی سال لاہور سے اخبار ''سیاست'' کا اجرا عمل میں آیا، یہ اخبار سیاسی تحریکات کا حامی تھا۔ اس کے باغیانہ رویے کو دیکھتے ہوئے اخبار پر سینسر لگا دیا گیا، ایک غلط ترجمے کے سزا میں اس کے سب ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا اور اخبار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی ۱۹۲۱ء میں اس کے بانی و ایڈیٹر مولانا حبیب اللہ نے تحریک خلافت میں حصہ لیا تو تحریک میں شمولیت کی پاداش میں انہیں بھی تین برس کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔''

(۳۷) اخبار ''کانگریس''

۱۹۱۹ء میں اخبار ''کانگریس'' کا اجرا عمل میں آیا، یہ اخبار دہلی سے نکلتا تھا اور کانگریس پارٹی کا ترجمان تھا۔ اس کے مہتمم لالہ شنکر تھے۔ یہ اخبار قومی پالیسی پر عمل پیرا تھا، مگر زیادہ دن نہ چل

سکا اور جلد ہی بند ہو گیا۔''

(۳۸) اخبار ''ملاپ''

۱۲/اپریل ۱۹۲۳ء کو مہاشہ خوشحال چند کی زیرادارت اخبار ''ملاپ'' کا اجراہوا ۔مہاشہ خوشحال چند نے ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیااوراپنی تحریروں کے ذریعہ عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ ''ملاپ'' میں انگریزوں کے خلاف کارٹون وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔''

(۳۹) اخبار ''الجمعیۃ''

روزنامہ ''الجمعیۃ'' گلی قاسم جان ،دہلی سے ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا ،اس اخبار کے مدیر اعلیٰ ابوالاعلیٰ مودودی تھے ۔اس کے علاوہ جن صحافیوں نے بحیثیت ایڈیٹر اس اخبار کی خدمات انجام دیں ،ان کے نام مولانا حامد الانصاری غازی،مولانا عثمان فارقلیط اور ہلال احمد زبیری وغیرہ ''الجمعیۃ'' میں مذہبی اورسیاسی دونوں طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے۔''

(۴۰) اخبار ''پیغام''

اخبار ''پیغام'' پشاور سے ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا، اس کے مدیر سید میر عالم شاہ ایک بیباک اورنڈر صحافی تھےانہوں نے انگریزوں کی سفاکانہ پالیسی کے خلاف قلم اٹھااس اخبار کی پالیسی حکومت کے خلاف تھی ،اس کی تحریریں بہت جذباتی ہوا کرتی تھیں اوران میں انتہاپسندی پائی جاتی تھی اس اخبار کی زندگی مختصر رہی،اس کے تین پرچے شائع ہوئے اور تینوں بحق سرکار ضبط کرلیے گئے ،نیز ایڈیٹر کو تین سال قید بامشقت کی سزا ملی۔'' (ص۱۷۹تا۲۰۴)

اُس دور میں جہاں روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات نے حریت پسندی کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تو رسائل وجرائد بھی آزادی کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ پروفیسر صدیقی نے ایسے کئی رسائل وجرائد کی تحقیق میں لکھا ہے:

> اُس دور کا ایک رسالہ ''منادی'' تھا، اس کے مدیر خواجہ حسن نظامی تھے، یہ رسالہ ۱۹۲۰ء میں کوچہ چیلان سے جاری ہوا ''منادی'' تصوّف کی اساس پر جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے ایڈیٹر نے تحریک آزادی کے واقعات، حالات اور کوائف پر بھی لکھا۔'' (ص۲۰۳)

پروفیسر صدیقی نے اردو رسائل اور جرائد کی تحقیق کے حوالے سے معین عقیل کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اُس دور میں بعض اُردو رسائل اور جرائد نے بھی سیاسی ماحول کے اثرات اخذ کر کے سیاسی رائے عامہ کی ترجمانی کی۔ ''ہمایوں'' میاں بشیر نکالتے تھے، نیاز فتح پوری نے ''نگار'' کا اجرا کیا، حافظ محمد عالم نے ''عالمگیر'' نکالنا شروع کیا تھا، حکیم یوسف حسن ''نیرنگ'' نکالتے تھے ''ادبی دنیا'' شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں نکلتا تھا، شاہد احمد دہلوی نے ''ساقی'' کا اجرا کیا، ''ادب لطیف'' لاہور سے جاری ہوا۔ قدیم رسائل میں ''معارف'' اور ''جامعہ'' باقاعدگی سے نکلتے تھے۔ ''ترجمان القرآن'' مذہبی مقصد رکھتا تھا لیکن اس نے سیاسی مباحث کو بھی اہمیت دی اسے مولانا مودودی حیدر آباد دکن سے نکالتے تھے۔ یہ تمام رسائل اپنے عہد کے نمائندہ صحیفے تھے۔'' پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے عتیق احمد صدیقی کے خیالات بھی نقل کیے ہیں جس میں انہوں نے اُس دور کے اخبارات ورسائل کے مزحمتی رویے کا جائزہ لیا ہے۔

بحیثیت مجموعی پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا زیرِ نظر مقالہ اُس دور کے سیاسی حالات اور حریت پسندانہ جدوجہد، انگریزوں کے مظالم، غرض کہ جنگ آزادی کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

❀❀

تحریک آزادی اور اُردو نثر
ایک معروضی تجزیہ

''تحریک آزادی اور اُردو نثر'' یہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی وہ شاہکار و مایہ ناز تصنیف ہے جس کی اِشاعت اوّل راجستھان بورڈ آف مسلم وقفس (جے پور) کے زیر اہتمام ۱۹۹۷ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس کی مقبولیت اور طلبہ کی نصابی ضرورت وتسہیل کے پیش نظر اِس کی اشاعتِ ثانی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا آزاد یونیورسٹی (جودھپور) نے اِس خلا کو پُر کر کے ایک احسن کام انجام دیا، مزید یہ کہ ڈاکٹر چمن لال (جمو یونیورسٹی) کی نگرانی میں راکیش کمار کو M.Phill کی ڈگری تفویض ہوئی اور ۲۰۱۴ءمیں اِس کا انگریزی Version بھی شائع ہو چکا ہے، جسے پروفیسر صدیقی نے خود ترجمہ کیا ہے اور ڈاکٹر ثنا کوثر نے اس کتاب کا ہندی ترجمہ نہایت فصیح اور معیاری زبان میں پیش کیا ہے۔

ایک سوساٹھ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہر باب کا بالترتیب متنی تجزیہ پیش کر دیا جائے تا کہ مختلف یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم M.Phil اور Ph.D کے طلبہ استفادہ کر سکیں اور قارئین کا ذوق لطیف بھی برقرار رہے۔

باب اوّل: تحریک آزادی کا تاریخی پس منظر

پروفیسر ضیاءالرحمٰن صدیقی نے اس باب میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے، اُن محرکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزوں سے ہندوستانی عوام اور عسکری قوت کے بیچ تنفر کا سبب بنے اور اُنہوں نے اِجتماعی طور پر انگریزوں کے خلاف سرکشی کا قصد مصمم کر لیا، اِس لہوانگیز انقلاب کی روداد بیان کرنے کے ساتھ، پروفیسر صدیقی نے اِس کے نتائج اور دیرپا اثرات بھی وضاحت کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ پروفیسر ضیاءالرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> آزادی کی جنگ ایک تاریخی جنگ تھی جو کسی فوری منصوبے کا
> نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی تیاریوں کا سلسلہ ''جنگ پلاسی'' اور
> میسور کی جنگوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چربی والے کارتوس
> آزادی کی اِس جنگ کے لیے بہانہ بن گئے اور ۱۸۵۷ء میں
> اِس نے شدت اختیار کر لی۔'' (ص ۱۳)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی شرق الہند کمپنی، جزائر شرق الہند میں کاروباری مواقع کی تلاش کے لیے تشکیل دیا گیا ایک تجارتی ادارہ تھا۔ پروفیسر ضیاءالرحمٰن صدیقی مذکورہ کمپنی کے پس منظر میں لکھتے ہیں:

> ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل انگلستان میں یکم دسمبر ۱۶۰۰ء کو ہوئی
> تھی لندن کے چند انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی

تشکیل کی تھی جس کا مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا، اس کمپنی کو ملکہ ایلز بیتھ کے ایک چارٹر کی رو سے ہندوستان میں پندرہ سال کے لیے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔'' (ص ۱۳)

اس کے پس منظر میں پروفیسر صدیقی نے پنڈت جواہر لال نہرو کی ''تلاش ہند'' جلد دوم سے ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے جس کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اصل مقصد، جس کا قیام صرف اس لیے عمل میں آیا تھا کہ ہندوستان میں تیار کی گئی اشیا، خصوصاً ہندوستان کا کپڑا اور مختلف النوع کے مسالے یہاں سے لے جا کر انگلستان میں فروخت کیے جائیں جہاں ان کی بہت طلب اور کھپت تھی۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی حریف ولندیزی (Dutch) اور پرتگیز پہلے ہی موجود تھے۔ اس وقت یہ اندازہ لگانا یقیناً مشکل ہوگا کہ اس کمپنی کو اپنے ملک سے بیس گنا بڑے اور دنیا کے امیر ترین ملک اور اس کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی پر حکومت کرنی ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

انگریز ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے اُنھوں نے اپنے مقبوضات کو بڑھانا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ سیاسی امور میں دخیل ہونے لگے، ہندوستانی تجارت پر انگریز اور ولندیزی (Dutch) قابض تھے، ادھر فرانسیسی بھی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے لگے، انھوں نے بہت جلد پانڈیچری چندرنگر، ماہی، کاریگل اور چند دیگر بندرگاہوں پر کوٹھیاں قائم کرلیں۔'' (ص ۱۴)

پروفیسر صدیقی مذکرہ بالا اقتباس کی توضیح میں باری علیگ کی تصنیف ''کمپنی کی حکومت'' سے ایک طویل اقتباس نقل کرتے ہیں، جس میں باری علیگ لکھتے ہیں کہ: ''اٹھارہویں

صدی کے وسط میں جب انگریز اور فرانسیسیوں کے سیاسی اور معاشی مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے تو دوسری جنگوں کے علاوہ ہندوستان میں بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے، ان لڑائیوں کا آغاز کرناٹک میں ہوا۔ تین لڑائیاں ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں کہ ان لڑائیوں نے جہاں ہندوستان میں فرانسیسیوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کر دیا، وہاں ان لڑائیوں نے انگریزوں کے لیے مشرق میں ملک گیری کے دروازے کھول دیے تھے۔''

۲۳ر جون ۱۷۵۷ء برصغیر کی تاریخ کا عہدساز دن ہے کہ جب اِس خطے کے مسلمانوں کی غلامی کے دور کا آغاز ہوا، یہ تاریخ جنگ پلاسی کی تاریخ ہے جو صرف نو گھنٹے چلی اور اس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کی غلامی دو صدیوں تک جاری رہی، اس جنگ نے میر جعفر نام کے ایک کردار کو برصغیر کی تاریخ میں غداری اور وطن فروشی کا استعارہ بنا دیا۔ اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> بنگال کے نواب علی وردی خاں نے اپنے بعد اپنے نواسے سراج الدولہ کو بنگال کا نواب مقرر کیا تھا۔ علی وردی خاں انگریزوں کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھا اور انگریزوں کی حکمت عملی کو سمجھتا تھا۔ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینا چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی، مرنے سے قبل اس نے اپنے جانشین سراج الدولہ کو اِن الفاظ میں نصیحت کی تھی۔ ''مغربی قوموں کی اِس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو اُنہیں ہندوستان میں حاصل ہے، اگر میری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اِس اندیشہ کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔'' (ص ۱۶)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اِس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کلائیوں اور سراج الدولہ کی فوجیں ۲۱ر جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی

کے میدان میں اُتر آئیں ۲۳؍جون ۱۷۵۷ء کو زبردست معرکہ ہوا جس میں اپنے ہی کچھ جرنیلوں کی غداری کی بدولت سراج الدولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور بالآخر جان سے ہاتھ دھونا پڑا، میر جعفر، درلب رام، جگت سنگھ اور یار لطف خان وغیرہ نے کلائیو سے مل کر نواب کے ساتھ غداری کی لیکن میر میدان اور موہن لال نے انگریزوں کا جم کر مقابلہ کیا میر میدان زخمی ہو کر گرا اور جاں بحق ہو گیا میر میدان کی موت سے نواب دل شکستہ ہو گیا ادھر میر جعفر کے پیہم اصرار پر سراج الدولہ نے موہن لال کو بھی میدان سے واپس بلا لیا، نواب کی فوج منتشر ہو گئی اور اس طرح فوج میں تباہی مچ گئی۔ جنگ کے بعد سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ میر جعفر کی حراست میں رہا، رات کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اُسے قتل کر دیا۔'' (ص ۱۷)

پلاسی کی جنگ نواب بنگال سراج الدولہ اور اُس کے حلیفوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ اِس جنگ نے بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی موجودگی کو مستحکم کیا جو اگلے سو برسوں میں ہندوستان کے بیشتر حصوں پر پھیلتا چلا گیا۔

پلاسی کی فیصلہ کن جنگ نے انگریزوں کے ہندوستان میں پیر جما دیے اِس جنگ میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کے شعلے بھڑکتے رہے اور وہ پلاسی کے میدان میں اِس تاریخی جنگ کی یاد تازہ کرتے رہے ہندوستان کے غیور فرزندوں کے دلوں میں اپنے ملک کی محبت کا جذبہ بیدار رہا، جنگ کے سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں وہ یہ

کہہ کر میدان اُتر آئے ''آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے'' جنگ پلاسی میں ہندوستانیوں کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کلائیوں نے اپنی سازشوں سے نواب کے خاص سپہ سالاروں میں پھوٹ ڈال دی تھی۔کلائیو اپنی زبان پر قائم نہ رہا،اس نے جو کچھ بھی کیا،وہ کمپنی کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے کیا۔''(ص ۱۷)

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کی مسلح جنگ ہے جسے انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دیا۔عموماً اس کے دو اسباب بیان کیے جاتے ہیں اوّل یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے بیشتر صوبے اور کئی ریاستیں یکے بعد دیگرے اپنی حکومت میں ضم کر لی تھیں،جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں کمپنی کے تئیں شکوک اور احتمالی خیالات جنم لینے لگے تھے۔دوم یہ کہ ان دنوں جو کارتوس فوجیوں کو دیے جاتے تھے،وہ عام خیال کے مطابق سور اور گائے کی چربی سے آلودہ ہوتے تھے اور انہیں بندوقوں میں ڈالنے سے قبل دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ہندو اور مسلم فوجیوں نے اِسے اپنے مذاہب وعقائد کے منافی خیال کیا اور ان میں کھلبلی مچ گئی،جن فوجیوں نے چربی آلود کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا ،اُن کی وردیاں اتار کر ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔تاریخ کی کتابوں میں اس قسم کے بہت سے واقعات کا ذکر ملتا ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ سینکڑوں فوجیوں کی سرعام وردیاں اُتاری گئیں اور انہیں قید بامشقت کی سزا دی گئی۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اپنا تحقیقی نقطۂ نظر اِس طرح بیان کرتے ہیں:

انگریز مورّخین نے اس جنگ کو غدر،بغاوت اور فوجی شورش کے نام سے موسوم کیا ہے اور وہ اُسے جنگ آزادی کی پہلی جنگ تسلیم نہیں کرتے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ غدر تھی نہ بغاوت اور نہ فوجی شورش،صحیح معنوں میں یہ تحریک تھی جس کو

ہندوستان کے حریت پسند عوام نے انگریز عملداری کے جبر وتشدد اور جور وستم سے تنگ آ کر انگریز سامراج کے خلاف لڑی تھی ۔کوئی غیر جانبدار مورّخ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس جنگ کا مقصد محض ملک کی آزادی اور اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت تھا،اس کے برعکس انگریزوں کا مقصد ملک و قوم پر اپنا تسلط جمانا،ہندوستان کے عوام پر مظالم توڑنا اور آمرانہ نظام قائم رکھنا تھا۔انگریز حکام کے مسلسل مظالم سے ہندوستانیوں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور مسلسل تکالیف،مصائب اور لوٹ کھسوٹ سے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔''(ص ۱۸ تا ۱۹)

لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie)۱۸۴۸ء میں ہندوستان آیا،اس کے عہد میں برما اور سکھوں کی دوسری لڑائی ہوئی اور پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ڈلہوزی نے ہندوستانی ریاستوں کے الحاق پر بڑی سختی سے عمل کیا،اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

۱۸۵۶ء تک لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل رہا،اس نے اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کر کے ہندوستان میں کمپنی کی بنیادوں کو استوار کیا۔''(ص ۱۹)

اس ضمن میں پروفیسر ضیا الرحمٰن صدیقی باری علیگ کی تصنیف سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں،جس میں باری علیگ رقمطراز ہیں کہ''لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں کمپنی کی فتوحات کو مکمل کر دیا تھا۔انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی تسخیر کا خاکہ تیار ہوا تھا،اس میں ڈلہوزی نے سرخ رنگ بھر دیا،ہندوستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمپنی کے قبضے میں آیا۔''علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے لندن میں منعقدہ ایک الوداعی تقریب میں لارڈ کیننگ کی تقریر کا جزوی حصہ نقل کیا ہے جس میں لارڈ

کیننگ (Lord Canning) اپنے دورِ حکومت میں ہندوستان کے حالات پرامن ہونے کا یقین دلاتے ہوئے یہ بھی اظہار کرتا ہے کہ ہندوستان کی فضا میں آزادی کی جو چنگاری سلگ رہی تھی، وہ شعلہ بن چکی ہے، جس کی لپٹوں میں ہمارے وجود بھی محفوظ نہیں ہیں۔''

انگریزوں نے ڈاکٹرین آف لیپس (Doctrine of Lapse) کی طاقت کے ذریعے انیسوی صدی کے شروع میں یہاں کی مختلف ریاستوں پر قبضہ جمالیا، اس ضمن میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> لارڈ ڈلہوزی نے لیپس (Lapse) کی پالیسی لاگو کی جس کے تحت سات ریاستوں، ستارہ، ناگپور، سمبل پور، جھانسی جیت پورہ، تجورہ اور کرناٹک وغیرہ کو انگریزی راج میں شامل کرلیا، لیپس کا مطلب یہ تھا کہ جن ہندوستانی راجاؤں نے کمپنی کے ساتھ دوستی کا صلح نامہ کیا تھا، ان میں سے کسی کے مرجانے کے بعد اگر اس کے کوئی بیٹا نہ ہوتا تو اس کی ساری ریاست پر انگریزی حکومت کا حق ہوجاتا تھا اور کمپنی اس پر قبضہ کرلیتی تھی۔'' (ص ۲۰)

بہادر شاہ ظفر اوّل کے عہد ۱۷۱۲ء سے بہادر شاہ ثانی کے عہد حکومت ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ سیاسی افراتفری اور زبوں حالی، خودغرضی وخانہ جنگی، قتل و غارتگری اور لوٹ کھسوٹ کے ہولناک واقعات کی تاریخ ہے۔ مزید یہ کہ ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے تخت نشیں ہوتے ہی ہندوستان میں انگریزوں کا زور بڑھ گیا۔ تحریک آزادی کے اسباب وعلل کے ضمن میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> بغاوت کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ دہلی کے ساتھ انگریز عملداری کا رویہ اچھا نہیں تھا اور بادشاہ دہلی کے ساتھ مسلسل نامناسب سلوک کیا جاتا تھا۔ بغاوت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ

انگریزوں نے اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کے ساتھ بھی نامناسب برتاؤ روا رکھا، مزید براں عیسائیوں کے مبلغ مختلف مقامات پر جاتے اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے ، اسکولوں میں عیسائی مذہب کے مطابق تعلیم دی جاتی اور بچّوں سے بھی عیسائی مذہب سے متعلق سوالات کیے جاتے جو عیسائی مذہب کے مطابق ان سوالوں کا جواب دیتا اس کو انعامات سے سرفراز کیا جاتا۔ انگریزوں کے اس مذہبی مداخلت سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں شکوک پیدا ہوگئے اور ان کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ انگریز ان کے مذہب کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔'' (ص۲۰)

انگریزوں کی مذہبی مداخلت سے متعلق پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے سرسید کی تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں سرسید لکھتے ہیں کہ ''پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے جسے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری ناراضگی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔''

عیسائی مذہب کی تبلیغ و تشہیر نہ صرف عوام میں کی گئی بلکہ عسکری صفوں میں بھی اِس کی تشہیر کی گئی، نیز بہت سے افسروں کو صرف اسی لیے اعلیٰ عہدوں پر معمور کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی سپاہ کو لالچ دے کر انہیں عیسائی مذہب میں داخل کرلیا جائے لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا ، ہندوستانی سپاہ رفتہ رفتہ انگریزوں سے متنفر ہوگئی۔

اس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے بنگال کی Infantry کے ایک انگریز کمانڈر کی سرکاری رپورٹ کا ایک مختصر حصہ نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ''میں لگاتار اٹھائیس سال سے ہندوستانی سپاہیوں کو عیسائی بنانے کی پالیسی پر عمل کررہا ہوں اور غیر عیسائی کی روح کو شیطان سے بچانا میرے لیے فوجی فرض کا ایک جز بن گیا ہے۔''

پروفیسر صدیقی نے ''اسباب بغاوت ہند'' سے ایک اور اقتباس کو سند بنایا ہے جس میں سرسید رقم طراز ہیں کہ ''مداخلت مذہبی میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور ناقبل اور ادنیٰ و اعلیٰ جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرکے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی کا یہی ہے۔'' پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں اس بغاوت کا جو سب سے بڑا سبب بتایا ہے وہ یہ ہے کہ لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کو شریک نہ کیا گیا، وہ بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان کے مصائب سے جوان پر گزری تھیں اور جس سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔'' (ص ۲۱ تا ۲۲)

لیکن پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے سرسید احمد خاں کے مندرج بالا رائے سے انحراف کیا ہے اور یہ ایک احسن بات ہے کیونکہ تاریخ میں اختلاف رائے معمولی امر ہے، یہ تحقیق حق میں کسی طرح حارج نہیں، تاریخی مساعی میں اختلاف رائے کا پایا جانا ایک اعتبار سے ضروری بھی ہے۔

علم تاریخ میں ایک فرد کی جدوجہد قطعی ناکافی ہوتی ہے کیونکہ کسی مورّخ کی نگاہ اِتنی ژرف نہیں ہوسکتی کہ واقعہ کو اُس کے پورے پس منظر میں دیکھے، مختلف آنکھوں کی مدد سے ہی وہ بصیرت حاصل ہوسکتی ہے جس سے واقعہ کی ماہیئت کو کماحقہ دیکھا جاسکے۔ لہٰذا پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> راقم الحروف سرسید احمد خاں کی مذکورہ بالا رائے سے متفق نہیں ہے اور انگریز مورّخین بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ گورنمنٹ رعایا کے تمام تر مصائب اور تکلیفوں و پریشانیوں سے بخوبی

واقف تھی اور جان بوجھ کر انگریزوں نے ہندوستانی عوام اور
خصوصاً مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جس سے ان میں غم وغصہ
پیدا ہوگیا اور یہ لاوا ۱۸۶۷ء کے انقلاب کی شکل میں پھٹ
کر رہا۔''(ص۲۲)

۱۸۵۷ء کے اسباب وعلل کے ذیل میں انگریزی استحصال الجبر اور غدر کی ہولناکیوں کے مناظر سے متعلق پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ایک فرانسیسی خاتون کی سوانح سے چند سطور نقل کی ہیں جس میں وہ لکھتی ہے کہ ''اکبرآباد اور اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی بغاوت کی خبریں نہ سنی جاتی تھیں لیکن ہندوستانی ملازموں کی صورت سے نارضامندی کی علامتوں اور بغاوت کے اثرات نمایاں تھے کہ اپنے خیالات کی پردہ داری نہ کر سکے تھے۔''

ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف پہلی مسلح جنگ جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا عموماً اس کے دو اہم سبب بیان کیے جاتے ہیں۔

اوّل یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے تمام صوبے اور کئی ریاستیں یکے بعد دیگرے اپنی حکومت میں شامل کر لی تھیں جس سے ہندوستانیوں کی نظر میں انگریزوں کی حیثیت مشکوک ہوگئی تھی اور ان کے دلوں میں اختمالی خیالات پیدا ہو گئے تھے۔

دوم یہ کہ جو کارتوس ہندوستانی سپاہ کو دیے جاتے تھے، وہ عام خیال کے مطابق سور اور گائے کی چربی سے آلودہ تھے نیز انہیں بندوقوں میں ڈالنے سے قبل دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا، ہندو اور مسلمان Infantry نے اِسے اپنے مذاہب کے منافی خیال کیا جس سے ان میں کھلبلی سی مچ گئی لہٰذا جن سپاہیوں نے مذکورہ چربی آلود کارتوسوں کو اِستعمال کرنے سے انکار کیا، اُن فوجیوں کی وردیاں اتار کر اُنہیں بیڑیاں پہنا دی گئیں، اُن میں ایسے فوجی بھی شامل تھے جنھوں نے انگریزوں کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اس حوالے سے پروفیسر صدیقی یوں روشنی ڈالتے ہیں:

چاروں طرف غدر کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں، عوام اور سپاہ متنفر

ہو چکی تھیں طرح طرح سے بغاوت کے پروپیگنڈے کیے
جارہے تھے، اشتہار چسپا ہورہے تھے، اسی اثنا میں جدید طرز
کے چربی والے کارتوس آئے جو سور اور گائے کی چربی سے تیار
کیے گئے تھے۔'' (ص۲۲)

اِس ضمن میں پنڈت سندر لال کی تصنیف ''سن ستاون'' کا مندرج ذیل اقتباس بہت اہم جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''بیرک پور کے پاس ان کارتوسوں کو بنانے کے لیے ایک کارخانہ کھولا گیا، ایک دن دم دم گلے ایک برہن سپاہی پانی کا لوٹا ہاتھ میں لیے بیرک پور کی طرف جارہا تھا۔ اتفاق سے ایک مہتر نے آکر پانی پینے کے لیے سپاہی سے لوٹا مانگا، سپاہی نے ہندو رسم ورواج کے مطابق لوٹا دینے سے انکار کردیا، اس پر مہتر نے کہا تم اب جات کا گھمنڈ نہ کرو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بہت جلد ہی تمہیں اپنے دانتوں سے گائے اور سور کی چربی کاٹنی پڑے گی۔''

برطانوی حکمرانوں کا احساس برتری حد سے تجاوز کر چکا تھا اور اس کی ایک صورت مقامی لوگوں کے مذہب، تہذیب یہاں تک کہ خود مقامی لوگوں کو بھی حقیر خیال کرتے تھے۔ قابل غور بات یہ تھی کہ ایک جانب وہ مقامی لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اور دوسری جانب انہیں یہ قبول نہیں تھا کہ مقامی لوگ اُن جیسے نظر آئیں، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ مقامی لوگوں کو اپنے لباس وضع قطع تراش خراش، زبان اور طور طریقوں کی نقل کرتے دیکھتے تو انہیں ''بندر'' کہتے یعنی تحقیر کی انتہا تھی اور ہندوستانیوں کی بڑی اکثریت اس تحقیر و تذلیل کو ہمیشہ محسوس کر رہی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ برطانوی سامراج کی اتنے گھناؤنے اور کراہیت آمیز رویوں کے باوجود ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کیوں ناکام ہوئی؟ اِس حوالے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی جیسے ژرف بین محقق اِن الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:

ملک گیر سطح پر اس بغاوت کی تاریخی ۳۱ رمئی طے پائی تھی اِس اثنا
میں چربی والے کارتوس آئے اور ہندوستانی سپاہ کو اس کے

استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا دیسی سپاہ نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تو انہیں سخت سزائیں دیں، میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہوسکا اور ۱۰ رمئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلادی، جو منصوبہ بغاوت کو شروع کرنے کا ہندوستانیوں نے بنایا تھا، اس سے قبل ہی جنگ کا آغاز کردیا گیا اگر جنگ کا آغاز طے شدہ تاریخ یعنی ۳۱ رمئی کو بیک وقت پورے ہندوستان میں ہوا ہوتا تو انگریز حکمرانوں کا ہندوستان پر قبضہ آسان نہ ہوتا۔'' (ص ۲۴)

۱۸۵۷ء جنگ آزادی کی ناکامی کی بہت سی علامتیں بیان کی گئی ہیں وہاں یہ عندیہ بھی قابل غور ہے کہ اس جنگ کی کوئی مرکزی قیادت نہیں تھی۔ مسلمانوں میں مزاحمت کی بڑی علامت جنرل بخت خان تھا۔ ہندوؤں میں نانا صاحب یا جھانسی کی رانی نے انگریزوں کے خلاف شجاعت مندی کی مثالیں پیش کیں لیکن یہ سب محض مقامی اثرات کے حامل تھے۔ اس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے مدلل گفتگو کی ہے:

ہندوستانی اس جنگ میں ناکام ہوئے، ناکامی کی بعض اہم وجوہ تھیں ہندوستان کے اعلیٰ طبقے اور والیان ریاست نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا بلکہ اس کے برعکس انہوں نے برطانوی حکومت کی مدد کی زمیندار طبقے کو اس بات کا خدشہ تھا کہ جاگیریں انگریزوں سے ملی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگیریں ان سے چھن جائیں۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانی کسی ایسے مرکزی لیڈر کا انتخاب نہ کرسکے جو پوری تحریک کی مجموعی قیادت سنبھالنے اور اور مختلف علاقوں اور طبقوں کے افراد کو متحد کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا۔ ہندوستانیوں کے پاس جدید

ہتھیار بھی نہیں تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی بھی کمی تھی، سب سے زیادہ یہ کہ وہ کسی طرح منظّم نہیں تھے، اس لیے وہ باقاعدہ محاذ بنا کر نہیں لڑے انگریزوں نے ڈاک اور تار کے نظام سے بھی فائدہ اٹھایا جبکہ ہندوستانیوں کو اس سلسلے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا انگریزوں کو گوالیار کے شنکر راؤ، حیدرآباد کے سالار جنگ نیپال کے جنگ بہادر مان بہادر سنگھ اور سکھوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔" (ص ۲۵)

پروفیسر صدیقی نے اِنہی وجوہ سے بحث کرتے ہوئے ماہنامہ آجکل اردو کے شمارہ اگست (آزاد نمبر) ۱۹۵۷ء سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کا ایک اہم اقتباس کو سند بنایا ہے جس میں مولانا لکھتے ہیں کہ "بغاوت کے برعکس سربراہوں میں کبھی اتفاق رائے نہ ہوسکا، وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے، اس کے برخلاف انگریز اپنی ملکہ کے تئیں وفاداری کے جذبے کے تحت لڑ رہے تھے۔"

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اپنی بحث کو مزید وسعت دیتے ہوئے ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور اس کی سمت و رفتار پر بھی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

ہندوستانی جانبازوں میں رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) روہیل کھنڈ کا بخت خان، اودھ کی بیگم حضرت محل تانیتا ٹوپے، احمد شاہ، خان بہادر، کنور سنگھ وغیرہ ایسے قابل فخر لوگ تھے جو برطانوی سپاہ اور کمنڈروں سے کسی طرح کم نہ تھے لیکن اِن کی طاقت منتشر تھی اُن کا کوئی مرکزی محاذ نہیں تھا جہاں سے ان کی فوجوں کی تنظیم ہوتی اور مختلف علاقوں میں برسرپیکار ہوتے، اِن میں آپسی تال میل ہوتا یہ بہادر منظّم طور پر اور مشترکہ کمان کے تحت لڑنے کے بجائے اپنے

طور پر ہندوستان کے مختلف اطراف میں بہادری کے
جوہر دکھا رہے تھے۔'' (ص ۲۵)

۱۸۵۷ء سے متعلق جو تاریخی ناانصافی ہوئی، اس کا اہم سبب یہ رہا کہ متغیر حالات میں عرصہ تک جنگ آزادی کے مشارکین و مشاہدین کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ واقعات کی درست تصویر پیش کرتے، ظلم واستبداد کے خلاف جہاد حریت میں شکست بازو ہو جانا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن سامراجی حکومت نے محبان وطن کو ان کی بے نصیبی کے بعد جس ظلم و تعدی کا نشانہ بنایا اس کی مثال نہیں ملتی اور انگریزوں نے بالخصوص مسلمانوں میں مقتدر و متمول طبقے کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا۔ اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا باب ہے جو خونی واقعات سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس قیامت صغریٰ کے حالات وکوائف بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بغاوت ناکام ہوگئی بغاوت کے فرد ہونے کے بعد انگریزوں کے سفاکانہ انتقام اور قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع ہو گیا، مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے ان کی صنعت و حرفت تباہ کردی گئی، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، ان کے دین و ایمان کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں، انگریزوں کے مسلسل مظالم اور زیادتیوں سے تنگ آکر جب ہندوستانیوں نے نجات پانی چاہی تو انہیں سختی سے کچلا گیا اور انگریزوں نے انہیں ایسی عبرتناک سزائیں دیں کہ وہ چنگیز خان سے بازی لے گئے۔'' (ص ۲۶)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے ناکام ہونے کے المناک نتائج سامنے آئے اور یہ انگریز ہی تھے جن کے دور حکومت میں جیل کی سزا ناکافی تھی، اُنہوں نے کالا پانی ایجاد کیا، انگریزوں کے

زمانے کا گوانتانا مو تھا جبکہ اس سے پہلے انسانی تاریخ میں ایسی سزا کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ انگریزوں نے مجاہدین حریت کو صرف گولی مارنا کافی نہیں سمجھا، انھوں نے آزادی کے خواہش مندوں کو توپوں کے دہانوں سے باندھ کر اڑایا، انہوں نے انفرادی پھانسی کی جگہ اجتماعی پھانسی دریافت کی اور جگہ جگہ آزادی کے سپاہیوں کو درختوں سے لٹکانے کی رسمیں ایجاد کیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد رونما ہونے والے واقعات، ہولناکیوں اور اس کے نتائج کے حوالے سے پروفیسر صدیقی نے خلیق نظامی کی کتاب ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''لڑائی کے اِختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اِس قسم کی موت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تو اُن میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ ایک روز توپ کے بہت بڑے دھماکے سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر وحشت ناک چیخ بھی سنائی دی، دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا، یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جن کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے۔''

کتاب کے اِس حصہ میں خلیق نظامی کے ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ'' سے ایک اور اقتباس بہت اہم ہے جس میں خلیق نظامی لکھتے ہیں کہ ''سب سے زیادہ عبرتناک دہلی کی تباہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی ہنگامی تحریک کا مرکز نہ تھی بلکہ ایک تمدن کی آخری نشانی تھی، وہاں کی ہر چیز اپنی تاریخ رکھتی تھی انگریزوں نے اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی، چوک سعد اللہ خاں، اردو بازار، خانم کا بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ دریا گنج کی گھاٹی، کلیوں کا بازار، پنجابی کٹرا، دھوبی کٹرا، رام گنج، سعادت خاں کا کٹرا، رام جی داس کا گودام والے مکان کے علاوہ شاہی درگاہ، دارالبقا، اکبر آبادی مسجد، اورنگ آبادی مسجد، چوبی مسجد کو اس طرح مسمار کیا کہ نام ونشان تک باقی نہ چھوڑے۔''

اِسی کے ذیل پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے پنڈت سندر لال کا ایک اقتباس جوانھوں نے ''رسل'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مسلمانوں کو مارنے سے پہلے اُنہیں سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا، اُن پر سور کی چربی مل دی جاتی تھی اور پھر ان کے جسم جلا دیے جاتے تھے۔''

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ کی کتاب ''ہندوستان میں اکتالیس سال'' کا یہ اقتباس بھی دلدوز واقعات کی داستان بیان کرتا ہے کہ ''۱۸۵۷ء کے غدر میں ستائیس ہزار باغی مسلمانوں کو پھانسی دی گئی اور قتل عام میں جو مسلمان مارے گئے، اُن کا کوئی شمار نہیں۔'' اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مزید لکھتے ہیں:

> غرض یہ کہ مسلمان مرد عورت، بوڑھوں اور بچّوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی، غدر کے بعد جب مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ لگایا گیا تو پہلے کی بہ نسبت ایک چوتھائی آبادی بھی باقی نہ رہی تھی بغاوت کے اہم مراکز میں میرٹھ، دہلی، لکھنؤ اور روہیل کھنڈ کے نام خاص طور سے سامنے آئے ہیں ان کے علاوہ بجنور، مرادآباد اور امروہہ وغیرہ کے حریت پسندوں نے بھی اس جنگ میں بھرپور حصّہ لیا۔ دہلی میں خصوصیت کے ساتھ مسلمان انگریزوں کے تعذیب وتشدد کا نشانہ بنے۔ (ص ۲۸)

اِس سلسلے میں پروفیسر صدیقی نے خواجہ حسن نظامی کا ایک ایسا اقتباس نقل کیا ہے جو ایک انگریز افسر کے بیان پر مبنی ہے، جسے پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، وہ لکھتا ہے کہ ''ہم نے اس قسم کی سینکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوؤں میں لاشوں کے سبب جگہ نہ ہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں یا بیٹھی تھیں، جس وقت ہم نے انہیں نکالنا چاہا تو چیخنے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ اور گولی سے مار ڈالو، ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں، ہماری آبرو خراب نہ کرو اور جب ہم ان کو باہر نکالتے تو وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتیں تھیں اور بعض اُن میں بے بہوش ہو کر گر پڑتی تھیں۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس باب کے اختتام پر ''آکسفورڈ تاریخ ہند'' کا ایک بہت اہم اقتباس نقل کیا ہے جس کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے نتائج کتنے ہولناک تھے اور یہ بغاوت اپنے پیچھے بے شمار خوفناک حوادث، بے انتہا مصائب اور متعدد ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی جن کے ذکر سے بھی قلب کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں کہ'' انقلاب ۱۸۵۷ء پورے طور پر ناکام رہا، اِس عظیم شکست سے ہندوستانیوں نے کچھ تجربات حاصل کیے جس سے مستقبل میں وہ قومی تحریک کی اساس کو استوار کرنے کے لائق ہو گئے اور اس طرح ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا۔ واضح رہے، اِس جنگ میں ہندو اور مسلمان مل کر ہندوستان کی آزادی کے لیے برسرِ پیکار تھے لیکن انگریزوں کی سازش وخفیہ تدبیروں اور کچھ ہندوؤں کے مخاصمانہ رویوں اور سخت گیریوں کے سبب مسلمان اور ہندو الگ الگ قوموں کی صورت میں بٹ گئے اور پہلی مرتبہ دو قومی نظریوں کی بنیاد پڑی۔

❀❀

باب دوم: تحریک آزادی کا سفر
انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے آزادیٔ ہند تک

باب دوم میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام ۱۸۸۵ء سے آزادی ہند ۱۹۴۷ء تک جدوجہد آزادی کا مجمل Draft پیش کیا ہے۔ اِس سیاق میں انڈین نیشنل کانگریس کے بعض اہم اجلاس کا تذکرہ بھی موجود ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں میں منعقد ہوئے۔ پروفیسر صدیقی نے اس باب میں یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کیوں قائم ہوئی؟ ابتدا میں اس انجمن کے اغراض ومقاصد کیا تھے؟ اور آگے چل کر اس نے کیا صورت اختیار کی، اِسی کے ساتھ اُن تمام تحریکات اور حالات وواقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو جدوجہد آزادی کے سلسلے میں عمل پذیر ہوئے اور جن کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی عوام کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔۱۸۵۷ء کی ناکامی، انگریزوں کے ظلم و شدد اور ہندوستان کی باگ ڈور براہ راست برطانوی حکومت کی سپردگی میں آنا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے متعلق پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی حکومت
> ایسٹ انڈیا کمپنی سے منتقل ہوکر براہ راست حکومت برطانیہ کے
> زیرنگیں آگئی ادھر انگریزوں کی انتقامی کاروائی کا سلسلہ برابر

جاری رہا، مسلمان بالخصوص انگریزوں کے مظالم کے شکار بنے ہندوستانیوں نے بھی اپنے ملک کو آزاد کرانے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ایک طرف سیاسی سطح پر عوام کا استحصال دوسری طرف اس جبر وتشدد اور استبداد کے خلاف عوام کے دلوں میں سلگتی ہوئی غم وغصہ کی آگ! نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور حکومت نے مابین کشیدگی روز بروز بڑھتی رہی، اس صورت حال کے پیش نظر انگریزوں کو ایک ایسی انجمن بنانے کی فکر ہوئی جس سے عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ قائم ہو سکے اور حکومت کے خلاف عوام کے دلوں میں پنپتی ہوئی مخالفت کا مناسب طریقے سے سدِ باب کیا جاسکے لہٰذا ایک ریٹائرڈ افسر اے.او.ہیوم نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی تجویز وایما پر ۱۸۸۵ء انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک انجمن قائم کی'' (ص ۳۲)

مذکورہ وضاحت کے حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی انڈین نیشنل کانگریس کے قیام اور اُس کے پہلے اجلاس سے متعلق لکھتے ہیں:

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا خیال تو پہلے ہی چند سر برآوردہ انگریزوں کے ذہنوں میں آگیا تھا لیکن اس کی باضابطہ طور پر تشکیل ۱۸۸۵ء عمل میں آئی، انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸/دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں ڈبلوسی مینرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف اطراف سے آئے ہوئے بہتر (۷۲) نمائندوں نے شرکت کی۔'' (ص ۳۲)

پروفیسر صدیقی نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام ونہج اور اس کے مزاج کے متعلق

سر جان کنگ کی تصنیف ''پولیٹکل انڈیا'' (ترجمہ: سیاسیات ہند) صفحہ ۶۵ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتا ہے کہ'' کانگریس کی تشکیل مغربی تخیل اور مغربی نمونے کے مطابق ہوئی، اس کا تمام نظام اور اس کی روح مغربی ہے اور جن اغراض و مقاصد کا اس نے اعلان کیا وہ بھی مغربی سیاسیات ہی سے ماخوذ ہے۔'' انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی غرض و غایت پر لارڈ ڈفرن کا اقتباس بھی قابل غور ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ'' حاکم اور محکوم کے لیے یہی بہتر ہے کہ ہندوستان کے سیاستداں اصحاب سالانہ جمع ہو کر حکومت کو بتائیں کہ اس نظام میں کیا نقائص ہیں اور انہیں کس طرح رفع کیا جاسکتا ہے۔'' پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی ضرورت اور ہندوستانی عوام کے مسائل سے متعلق غیر ملکیوں کی دلچسپی نیز ایلن اوکٹیوین ہیوم (Allan Octavian Hume) کے اس انجمن کی ترویج و ترقی اور انہماک، اُس کے غور و فکر اور انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد عوام تک پہنچانے کے لیے Hume کے ہندوستان بھر میں دوروں اور ہندوستانی سیاستدانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے پیچھے لارڈ ڈفرن (Lord Duffrein) کی سوچ پر مدلل گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> انڈین نیشنل کانگریس نہ تو قومی جذبہ کے تحت قائم ہوئی تھی اور نہ اسے عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی تھی۔ ابتداً اس انجمن کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہمدوستانیوں میں پھیلی ہوئی بے چینی اور ان کے باغیانہ جذبات کو سمجھا جاسکے اور کانگریس کے اجلاسوں میں انگریز ہندوستانیوں کے باغیانہ خیالات اور منصوبوں سے باخبر ہو جائیں انڈین نیشنل کانگریس کے توسط سے اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں اور ہندوستانیوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکیں لیکن انگریزوں کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے آہستہ آہستہ کانگریس نے قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی آخر میں یہی انجمن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے

انحطاط کا اور زوال کا باعث بن گئی۔'' (ص ۳۳)

اس ضمن میں سر آکلینڈ کی تقریر کا یہ حصہ بہت اہم ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ'' کانگریس کی تحریک قوم پرستوں اور باغیوں میں نفرت کی خلیج پیدا کر دے گی۔'' پروفیسر صدیقی آگے لکھتے ہیں:

> سر آکلینڈ کے مذکورہ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دوررس اور دانشور انسان تھا۔ اس کی پیش گوئی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں صادق آئی کیونکہ اس وقت تک کانگریس نے مکمل طور پر قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ان انجمن انگریزوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی قومی نجمن بن چکی تھی اور اس کا نصب العین یہ قرار پایا تھا کہ''انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی کردار نہ صرف وطن کے لیے آزادی حاصل کرنا تھا بلکہ ہندو مسلم، سکھ عیسائی اتحاد سے ذات برادری اونچ نیچ کی تفریق ختم کر کے غریب امیر کے فرق مٹا کر ایک متحدہ ہندوستان حاصل کرنا تھا۔'' (ص ۳۴)

اس سلسلے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے گاندھی جی کی تقریر کا ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے جو دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء کے موقع پر دی تھی کہ'' کانگریس ان بے زبان، مفلس اور فاقہ کش لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں سات لاکھ دیہاتوں میں آباد ہے اور اس سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور آیا وہ برطانوی ہندوستان کے باشندے ہیں یا ریاستوں کے؛ اُن کی حفاظت کو کانگریس ہر طرح پیش نظر رکھے گی اور اگر میں کہوں تو کوئی مبالغہ تصور نہیں ہوگا کہ کانگریس ان بے زبان اور فاقہ مست لوگوں کی خاطر ہر ممکن قربانی کرے گی اس لیے یہ کسانوں اور غریبوں کی حمایت کہی جا سکتی ہے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے بیسویں صدی کے اوائل میں کانگریس میں اختلافات پیدا ہونے، ۱۹۰۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس کا

انعقاد کے موقع پر کانگریس انتہا پسندی کا سراغ لگاتے ہوئے لکھا ہے:

> ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کی ابتدا تک کانگریس کی پالیسی معتدل تھی جوں جوں وقت گزرتا گیا، کانگریس کی پالیسی میں تبدیلی آتی گئی ۱۹۱۷ء میں کانگریس پر انتہا پسندوں کا تسلط ہو گیا یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی افریقہ سے ہندوستان آئے تھے اور انھوں نے آزادی کی تحریکوں میں ناضابطہ حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب امرتسر میں پنڈت موتی لال نہرو کی زیرِ صدارت کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا گذارشات اور عرض داشتوں کی جگہ قومی مطالبات نے لے لی، اسی سال کانگریس کا نصب العین ''سوراج'' قرار دیا گیا۔'' (ص ۳۶)

آزادی سے قبل صوبہ بنگال آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے دیگر صوبوں سے بڑا تھا، ایک عام اندازے کے مطابق اس کا کل رقبہ دو لاکھ مربع میل سے زیادہ اور اس کی آبادی آٹھ کروڑ پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ بنگال کا اقتصادی اور معاشی نظام پورے طور پر ہندوؤں کے کنٹرول میں تھا ۱۹۰۵ء میں جس وقت لارڈ کرزن (Lord Curzon) ہندوستان کا وائسرائے تھا، اس کی سفارشات پر برطانوی پارلیمنٹ نے بنگال ٹکڑے کر دیے، اس ضمن میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی عوام کا شعور پورے طور پر بیدار ہو چکا تھا، نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ لارڈ کرزن جو ۳۰/ دسمبر ۱۸۵۷ء میں ہندستان کا وائسرائے بن آیا تھا، اس نے ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، تقسیم بنگال کی کاروائی کے سبب ہندوستان میں اچھی خاصی شورش پیدا ہوگئی اور ہندوستان کے عوام صوبہ بنگال کی تقسیم کے مسئلے پر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئے۔'' (ص ۳۶)

یوں تو غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ کے قیام کی بہت سی وجوہ بتائی جاتی ہیں مثلاً مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کو بڑھانا نیز تحفظ کرنا اور حکومت کے سامنے ان کی ضروریات وخواہشات کی نمائندگی کرنا تھا۔ آریہ سماج جیسی تحریک کا قیام بھی اس کی ایک وجہ تھی۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مسلم لیگ کے قیام کے حوالے لکھتے ہیں:

> یہی وہ دور تھا جب مسلم کے قیام کا شعور پیدا ہوا اور ''ہندو مہاسبھا'' اسی سال معرض وجود میں آئی ۔۹ر نومبر ۱۹۰۶ء کو نواب سلیم اللہ خاں بہادر (ڈھاکہ) نے ایک تحریر جاری کی جس میں تجویز کیا گیا کہ مسلم انڈیا کنفریٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے ،اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور مجوزہ کاموں کا خاکہ بنا کر بزرگان قوم کے سامنے پیش کیا گیا اور مشوروں کے لیے دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی ،اس کے ساتھ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی گئی۔اس موقع پر ہندوستان کے تمام مسلم سیاسی رہنماؤں کا اجتماع ہوا۔'' (ص ۳۶)

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء میں حصہ لینے والے ہندوستانی فوجیوں کی تعداد آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کنیڈا، جنوبی افریقہ اور جزائر سے بھی زیادہ تھی۔اس غیر معمولی تعداد سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہندوستانی سپاہ نے انگریزوں کی کتنی اعانت کی ،اس غیر معمولی اعانت کے پیچھے انگریزوں کے وہ وعدے تھے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستانیوں کے جائز حقوق بحال کر دیئے جائیں گے،اس ضمن میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی ،ہندوستانیوں نے اس جنگ میں انگریزوں کی بھرپور اعانت کی اور کمک پہنچائی

تقریباً دس لاکھ ہندوستانی برطانیہ کی طرف سے لڑنے کے لیے گئے ،انھوں نے فرانس سے مشرقی افریقہ تک اپنی بہادری اور وفاداری کے جوہر دکھائے انگریزوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر وہ ان کے جائز حقوق دیدیں گے لیکن ۱۹۱۸ء میں جب جنگ ختم ہوئی تو انگریز اپنے وعدے سے منحرف ہوگئے ،مزید برآں ہندوستانیوں پر سخت ترین قوانین نافذ کیے گئے اور شدت کے ساتھ حریت پسندوں کو کچلنے کی کوششیں ہونے لگیں ادھر ۱۹۱۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں ایک ساتھ ہوئے۔'' (ص ۳۷)

ہندوستانیوں کے جذبۂ حریت کو کچلنے کے لیے سامراجی قوت نے ایسے قوانین وضع کیے جن کی مدد سے بغیر وارنٹ گرفتاری اور مقدمہ کے بغیر غیر معینہ مدت تک حراست کا اختیار حکومت کو مل جائے ،اس سلسلے میں رولٹ ایکٹ بہت اہم ہے،جس کے متعلق پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

۱۹۱۷ء کے اواخر میں مسٹر جسٹس اے .رولٹ کی قیادت میں رولٹ ایکٹ کمیٹی قائم ہوگئی،اِس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ اندرون ملک حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کی تحقیقات کے اوران کا انسداد بھی کرے اِس ضمن میں اپریل ۱۹۱۸ءکو رولٹ ایکٹ کمیٹی کے تحت رپورٹ پیش کی گئی اور ہندوستانی عمائدین اورعوام کی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی ۔رولٹ ایکٹ کا واضح مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عمائدین اورعوام کو گرفتار کرکے تحریک کو دبادیا جائے جس سے وہ آگے سرنہ اٹھاسکیں لیکن اس کا ردِّعمل یہ ہوا کہ ہندوستان کے عوام اور بھی

سرگرم ہوگئے مسٹر جناح اور گاندھی جی نے اس ایکٹ کی
شدت سے مخالفت کی'' (ص ۳۸)

اِس سیاق میں رولٹ ایکٹ کے تحت عمائدین اور عوام کی گرفتاریوں کے انسداد میں ستیہ گرہ کی تحریک بڑی اہمیت کی حامل ہے بلکہ یہ تحریک سیاسی اور سماجی کارکنوں کے لیے ایک بیش بہا تحفہ تھی کیونکہ یہ تحریک عدم تشدت کے فلسفے پر مبنی تھی۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

اِس صورت حال کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ اگر
حکومت کا یہی طریقہ رہا تو ہم ستیہ گرہ کی پالیسی اپنانے پر مجبور
ہوجائیں لیکن حکومت کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں
ہوئی، گاندھی جی مجبور ہوکر رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی
تحریک شروع کردی (ص ۳۸)

مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں پروفیسر صدیقی نے گاندھی جی کی تقریر کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا ہے:

''ستیہ گرہ حلف اٹھاتا ہے کہ اگر رولٹ ایکٹ منظور کرلیا گیا اور
اسے قانون کی صورت دیدی گئی تو وہ ان قوانین کی پابندی نہیں
کرے گا تاوقتیکہ قوانین واپس نہ لے لیے جائیں۔''

(ص ۳۸)

لہٰذا رولٹ ایکٹ کی ہندوستانیوں نے شدت سے مخالفت کی، اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے بپن چندر کی تصنیف ''جدوجہد آزادی'' سے ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ''جب گاندھی جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو انھوں نے ستیہ گرہ کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا، یہ تحریک نہ مقامی تھی اور نہ اس کے مقاصد محدود تھے، انھوں نے ایک ستیہ گرہ سبھا قائم کی اور ان ظالمانہ قوانین کی پابندی نہ کرنے کا ایک عہد نامہ تیار کیا ۶/اپریل ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا، اس کے بعد سول نافرمانی کی نوبت آئی تھی، ہڑتال کی

کامیابی بے مثال تھی۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس کی تفصیل میں مزید لکھتے ہیں:

گاندھی جی کی اِس مہم کا حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا، نتیجتاً ملک میں توڑ پھوڑ اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اجتماعی جلسے منعقد ہوئے، بمبئی، احمد آباد اور لاہور میں جہاں تہاں عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا ڈاکٹر سیف الدین کچلو، گاندھی اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا ۳ر دسمبر کو فیض آباد (یوپی) میں پولیٹکل کانفرنس کے اجلاس میں پنڈت جواہر لعل نہرو پچاس ہزار سے زائد کسانوں کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''انفرادی طور پر بھوک ہڑتال کرنے اور چھوٹے معاملات پر ستیہ گرہ کرنے کو ہم روا رکھیں گے ستیہ گرہ کا ہتھیار ضروری قومی مقاصد کے لیے مقصود ہے میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ مسلم لیگ نے ستیہ گرہ کے اصول کے حق میں فیصلہ کیا ہے، تاہم یہ ایک اچھی علامت ہے۔ لیگ نے سیاسی طور پر ایک بار بھی کانگریس کی تقلید کی ہمیں ملک میں آزادی کی جدوجہد کے لیے تیار ہونا چاہئے تمہیں آزادی ابھی تک نہیں ملی، اِس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ایک بہادر گڑھوالی پچھلے ساڑھے آٹھ سال سے جیل میں محبوس ہے اور ابھی تک اسے رہا نہیں کیا گیا۔'' (ص ۳۹)

ہوم رول لیگ تحریک بھی، دوسری سرگرم تحریکات کی طرح بہت اہم اور برصغیر کی قومی سیاسی تحریک ہے، جسے اینی بیسنٹ (Annie Besant) نے کئی اہم سیاسی عمائدین کے ساتھ مل کر قائم کیا تھا۔ انڈین ہوم رول لیگ کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس طرح روشنی ڈالی ہے:

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک ایسی خاتون کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا جو ہندوستانی نہ ہوتے ہوئے بھی جنگ آزادی میں برابر شریک تھی، جس نے ہندوستانی مجاہدین کی آواز میں آواز ملا کر جنگ آزادی میں حصہ لیا، اُس خاتون کا نام اینی بیسنٹ تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں اینی بیسنٹ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے ''نیو انڈیا'' کے نام سے ایک روز نامہ بھی جاری کیا تھا۔ اس خاتون کے دل میں ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ تھا، اس مقصد کی تکمیل کے لیے اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۷ء میں مدراس میں ہوم رول لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس میں ہندو، مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے اینی بیسنٹ کے انگریزوں کے خلاف تقریریں کرنا شروع کر دیں، اینی بیسنٹ کے اس باغیانہ رویہ کو دیکھ کر ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے انہیں نظر بند کر دیا۔''

(ص ۳۹)

اِسی کے ذیل میں پروفیسر صدیقی نے ڈاکٹر راجندر پرساد کی خودنوشت سے ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کر کے سارے ملک میں ہلچل چادی، تقریباً سبھی صوبوں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ سرکار اس سے گھبرا گئی تھی تو اس نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ کو ان کے دو ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کر دیا۔''

خلافت کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ اسلام کا، لیکن آج وہ ایک بھولا ہوا درس بن چکا ہے۔ تحریک خلافت کا یہ پہلو قابل ذکر ہے کہ اِس سے ہندوستان میں مکمل آزادی کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کی تخم ریزی ہوئی تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستانیوں کی

آنکھوں سے پردہ ہٹا کر انہیں اُجالے میں لا کھڑا کیا، اِس پروفیسر صدیقی نے اپنا تحقیقی نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے:

> مولانا محمد علی جوہر جب جیل سے واپس آئے تو انھوں نے ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم کی تا کہ اس سیاسی تحریک کے ذریعے انگریزوں کی منتقمانہ اور سفاکانہ پالیسوں کو بے نقاب کیا جاسکے ،مسلمانوں نے اس تحریک میں دلچسپی سے حصہ لیا خلافت تحریک کانگریس کا ایک اہم حصہ بن محمد علی ،شوکت علی اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے اثر انگیز تقریریں کیں اس تحریک میں جن سیاسی رہنماؤں نے موثر کردار ادا کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حسین احمد مدنی، غیاث اللہ فرنگی محلی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا حسرت موہانی، مشہر الحق خاں وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں ۔گاندھی جی بھی تحریک خلافت میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے کام لیا تھا۔'' (ص۴۰)

مندرج بالا بیان کی روشنی میں پروفیسر صدیقی نے قاضی عدیل عباسی کی تصنیف ''تحریک خلافت'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''تحریک خلافت سے ہمارے ملک میں آزادئ کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا ،تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اُس اجالے میں اُس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پالیا۔''

تحریک آزادی میں سانحہ جلیانوالہ باغ بہت مشہور ہے بلکہ عام طور پر زبان زد خلائق یہ

ہے کہ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر (Gr. Dyer) نے ہزاروں نہتے ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جو رولٹ ایکٹ قانون کے خلاف محو احتجاج تھے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیق نے اس تحقیقی مقالہ میں سانحہ جلیانوالہ باغ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے بلکہ جلیانوالہ باغ جسے امرتسر قتل عام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے؛ کے اسباب و محرکات اور اُس کا پس منظر اس طرح پیش کیا ہے:

> پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی، انگریز یہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کے عوام اپنے جائز حقوق کی مانگ کریں گے لہٰذا انگریزوں نے اس کے انسداد کے لیے 'رولٹ ایکٹ' کے نام سے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں سخت ترین سزایں دی گئیں اس سلسلے میں ہندوستانی رہنماؤں نے برطانوی سرکار کی سفاکانہ پالیسیوں کے خلاف ۱۲/اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلیانوالہ باغ عمارتوں سے محصور ایک کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں ایک تنگ راستہ تھا جہاں سے ایک مسلح کار بھی نہیں گزر سکتی تھی اس احاطہ میں مختلف لوگوں کے اندازے ک مطابق تقریباً پچاس ہزار لوگ جمع تھے لوگ پر امن طریقے سے اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن رہے تھے۔ جنرل ڈائر اور اس کے ساتھی صدر دروازہ سے داخل ہوئے، جنرل ڈائر نے فوراً اپنی فوج کی صفیں باندھ کر باغ کا محاصرہ کر لیا، ڈائر کے حکم پر انگریز سپاہیوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں، ہزاروں ہندو مسلمان اور سکھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچّے یتیم ہو گئے، جنرل

ڈائر کے بہیمانہ رویے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کا
جذبہ پیدا کر دیا۔'' (ص ۱۴۱)

اِسی سیاق میں پروفیسر صدیقی نے انڈین نیشنل کانگریس کی پنجاب سب کمیٹی کے مطابق لکھا ہے کہ ''جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام بچّوں سمیت بالکل بے قصور اور نہتے لوگوں پر ایک سوچا سمجھا وحشیانہ عمل تھا اور حالیہ برٹش حکومت کی تاریخ میں اپنی سنگ دلی میں لاثانی تھا۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مزید لکھتے ہیں کہ ''اِس حادثہ میں تقریباً دو ہزار ہندوستانی ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوئے، جلیانوالہ باغ کے خونچکاں حادثے کے سلسلے میں ۱۹۲۰ء میں ہنٹر کمیشن کی رپورٹ منظرِ عام پر آئی، یہ رپورٹ سرتاسر ہندوستانی عوام کے خلاف تھی۔''

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غیر ملکی مال کے بائیکاٹ اور نان کو آپریشن (ترکِ موالات) کی تجویز پیش کی، یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جو جنگِ آزادی اور قومی جدوجہد میں بہت کارگر ثابت ہوا، انگریز حکومت اِس کا نوٹس لینے پر مجبور ہوگئی کیونکہ یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ پورا ملکی نظام مفلوج ہوجائے گا اور عام بغاوت پھیل جائے گی، آثار انگریزی حکومت کے خاتمہ کی پیش گوئی کر رہے تھے اس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے مدلل گفتگو کی ہے:

۲۰ر مئی ۱۹۲۰ء کو منعقدہ بنارس کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں یہ
طے پایا کہ ترکِ موالات کی پالیسی اپنائی جائے، اس مقصد کی
تکمیل کے لیے یکم و۲ر جون کو مسلمانوں کا ایک جلسہ الٰہ آباد میں
منعقد ہوا اور ترکِ موالات کی پالیسی کو باضابطہ طور پر منظور کر لیا
گیا اور تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی مساعی کی جانے لگیں۔ مولانا
ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی ڈاکٹر سیف الدین کچلو
حسرت موہانی اور حاجی احمد صدیق جیسے سیاسی رہنماؤں نے
بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔'' (ص ۱۴۱)

ہندوستان کی آزادی اور قومی جدوجہد میں جہاں دیگر تحریکات نے مؤثر کردار نبھایا

وہاں ''تحریک عدم تعاون'' بھی بہت اہم ہے۔اس پر روشنی ڈالتے وئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا،اس اجلاس کی صدارت کے فرائض سی .آر داس کو انجام دینے تھے انگریزوں نے انہیں اجلاس سے قبل ہی گرفتار کرلیا چنانچہ مسیح الملک اجمل خاں نے اس اجلاس کی صدارت کی۔''(ص ۴۲)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مسیح الملک اجمل خاں کے خطبۂ صدارت کا ایک مختصر حصہ نقل کیا ہے جس میں کہتے ہیں کہ: عدم تعاون کی روح عام ملک پر طاری ہے۔اس براعظم کے دور دراز گوشوں میں کوئی بھی دل ایسا نہیں جو سوراج حاصل کرنے اور خلافت و پنجاب کی دست درازیوں کی دادرسی کے لیے ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کے جذبے سے لبریز نہ ہو۔''

اِسی ربط میں پروفیسر صدیقی نے حسین علوی کی تصنیف ''کاروان آزادی'' سے ایک بہت اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ رقم طراز ہیں کہ ''تحریک عدم تعاون کی کامیابی سے کون انکار کرسکتا ہے ہمارے کارکن بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کررہے ہیں،اپنے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ دن بدن زیادہ تعداد میں جیلوں کا رخ کررہے ہیں،اس سے زیادہ خوبیوں کی بات یہ ہے کہ حکومت کے بے پناہ جبر کے باجود کہیں بھی جواب میں تشدد پر عمل نہیں کیا گیا اس جبر نے قومی عزم کو اور پختہ کرنے کا کام کیا ہے جمعیۃ العلماء کے فتوؤں کی ضبطی،مقدمات کراچی،قانون اجلاس باغیانہ کریمنل اور اور امنڈمنٹ ضابطۂ فوجداری کو دفعہ ۱۴۴/ان سب کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ لوگوں میں اپنی قومی جدوجہد کو جاری رکھنے اور اپنے مطالبات پر ڈٹے رہنے کا عزم اور بھی پختہ ہوگیا ہے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مزید لکھتے ہیں:

عدم تعاون کی تحریک میں ملک کے ہر طبقہ کے افراد نے دلچسپی سے حصہ لیا عدالتوں،اسکولوں،کالجوں اور تمام اداروں سے

عدم تعاون کیا گیا اسکولوں، کالجوں کی سطح پر طلبہ نے انگریزوں
کا بائیکاٹ کیا، انگریزی مال کا استعمال بند کر دیا۔'' (ص ۴۳)

۱۹۲۷ء میں بر بانوہ ہند کے لیے ایک آئینی کمیشن مقرر کیا گیا، اس برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی برسرِ اقتدار تھی اور لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birkenhead) وزیراعظم تھے، چونکہ مذکوری کمیشن کے چیئرمین سرجان سائمن (Sir. John Simon) تھے اسی لیے اِسے عام طور پر سائمن کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مذکورہ کمیشن کے مقاصد سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

۱۹۲۷ء میں برطانوی پارلیمان نے ایک کمیشن مقرر کیا، جس
جس کے چیئرمین سرجان سائمن تھے، مقصد یہ تھا کہ کمیشن
صوبوں میں حکومت کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ پیش
کرے ۱۹۲۷ء جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو پورے ملک
میں کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا، احتجاجی جلسے ہوئے اور ہڑتالوں کا
سلسلہ شروع ہو گیا، اس کمیشن کے ہندوستان آنے کا مقصد یہ تھا
کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کی آڑ میں ہندوستانیوں کو بدنام
کرے، ہندوستانی کمیشن کی چال سمجھ گئے اور انھوں نے متحد
ہو کر کمیشن کا بائیکاٹ کیا، بمبئی میں عوام کی قیادت محمد علی جناح
کر رہے تھے، اِدھر لالہ لاجپت رائے بھی احتجاج ؤمیں شامل
تھے ایک احتجاجی جلوس میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں
برسائی گئیں جس کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہوگئی۔''
(ص ۴۳)

سول نافرمانی (Civil disobedience)، ترکِ موالات یا عدم تعاون اپنے مطالبات منوانے یا کسی فعل پر احتجاجی طور پر بعض حکومتی یا کسی عالمی قوت کے قوانین کی اطاعت

سے انکار کرنا ہوتا ہے، اِس میں عام طور پر حکومت کو محصول جمع کرانے سے انکار کرنا شامل ہے، جس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔

بہرکیف جہاں انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کے خلاف ہندوستان میں دوسری کئی تحریکیں کامیاب ہوئیں وہاں سول نافرمانی (Civil Disobedience) کی تحریک بھی کافی کارگر ثابت ہوئی، اِس تحریک سے ہندوستانیوں کے حوصلے بلند ہوئے، اُن کے عزام میں پختگی پیدا ہوئی اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> عوام نے ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی (Civil Disobedience) کی تحریک شروع کردی، اس تحریک کو بھی پرامن طریقے سے شروع کیا گیا، ہندوستان کے عوام نے بلا امتیاز مذہب وملّت اس میں بھرپور حصہ لیا کسی بھی تحریک کے جاری ہوتے ہی کامیابی کی طرف قدم بڑھنے لگتے تھے۔ عوام کے جذبے وجوش کو دیکھ کر انگریز خائف تھے انگریزوں کو یہ خدشہ ہونے لگا کہ ہندوستان میں اب زیادہ دنوں تک اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ ابوالکلام آزاد، گاندھی جی پنڈت نہرو، ڈاکٹر مختار انصاری وغیرہ مقتدر لیڈران کو گرفتار کرلیا گیا، ان سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک تو مدھم پڑ گئی لیکن آزادی کے تئیں محبان وطن کے جذبات میں مزید اضافہ ہوگیا۔'' (ص۴۴)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی مندرج بالا تحقیق کی روشنی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''تحریک آزادی'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ ''ہم نے آزادی اور حق طلبی کی جنگ میں ''نان وائلینس'' نان کوآپریشن کی راہ اختیار کی ہے ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر وتشدد اور خوں ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے لیکن ہمارا

اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہ کرنا چاہیے، اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے میں اسے فطرت اور عدل واخلاق کے مطابق پیش کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی کے دلائل سے متفق ہوں۔"

۱۹۲۸ء میں کانگریسی لیڈران استعماری حکومت سے نوآبادیاتی نظام کے لیے گفت و شنید کر رہی تھی لیکن حکومت نوآبادیاتی نظام کو ماننے پر آمادہ نہیں تھی گو کہ ہندوستانیوں نے فیصلہ کیا کہ اگر حکومت ہندوستان کو نوآبادیاتی حکومت کا درجہ مل جاتا ہے تو ہم تمام سیاسی سرگرمیاں واپس لے لیں گے، لیکن برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو کچھ بھی دینے کے حق میں نہیں تھی۔ مذکورہ تمام صورت حال اور اس کے نتائج کے تناظر میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے یوں روشنی ڈالی ہے:

> انگریزوں نے اس قرارداد کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا رہے، لہٰذا ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور کانگریس کے اجلاس میں رات کے ٹھیک بارہ بجے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس ہوگیا، یہ ریزولیشن انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں ایک اہم قدم تھا۔ ریزولیشن پاس ہونے کے بعد ہندوستان کے عمائدین سیاست اسے عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہوئے کروڑوں عوام نے ۲۶/جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں آزادی حاصل کرنے کا حلف اٹھایا۔" (ص ۴۵)

اِسی سیاق میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے حلف نامہ کا خلاصہ بیان کیا ہے جس میں درج ہے کہ: "برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام کو نہ صرف آزادی سے محروم کر دیا ہے بلکہ ہندوستانیوں کو ہر حیثیت سے تباہ کر دیا ہے۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کر لے اور کامل آزادی حاصل کر کے رہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لیے آزادی حاصل کرنے کے لیے مؤثر ذریعہ نہیں ہے، اس لیے ہم عدم تشدد کے اصول پر عمل کرتے

ہوئے حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے، سول نافرمانی کی تیاری کریں گے جس میں محصول کا ادا نہ کرنا بھی شامل ہوگا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو کسی قسم کی امداد نہ دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال دلایا جائے، تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا پندرہ روز میں خاتمہ ہو جائے گا، لہٰذا ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس ہم کو جو بھی ہدایت دے گی، ہم اس پر عمل کریں گے اور حصول آزادی کے لیے ہر قسم کی قربانی دیں گے۔''

ڈانڈی مارچ یا نمک تحریک آزادی ہند کا ایک اہم واقعہ ہے، یہ مارچ ۱۲/ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے ستیہ گری ساحلی شہر ڈانڈی گجرات کی طرف پیدل مارچ کیا، اِس مارچ کو واہٹ فلوئنگ ریور (White Flowing River) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں سبھی مشارکین نے سفید کھدر پہنی تھی۔ اس تحریک کے پس منظر سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> ہندوستانی اپنے عزائم پر عمل پیرا رہے، ادھر گاندھی جی نے قانوم نمک سازی کے خلاف تحریک شروع کردی ۱۲/ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی اٹھتر لوگوں کے ساتھ سابرمتی آشرم کے لیے روانہ ہوگئے اور گجرات کے دیہی علاقوں میں دوسو میل کا سفر کر کے ڈانڈی پہنچے جو ساحل سمندر پر واقع ہے، نمک قانون سازی کے خلاف ملک میں تقریباً ایک لاکھ عوام نے گرفتاریاں دیں۔ کانگریس کی مقبولیت اور اس کی چلائی ہوئی تحریکوں کی مسلسل کامیابی کو دیکھ کر برطانوی حکومت کشمکش میں مبتلا ہوگئی، حکومت نے جدید اصلاحات کے بارے میں غور وخوض شروع کردیا، اس سلسلے میں لندن میں مسلسل ۱۹۳۰ء ۱۹۳۱ء ۱۹۳۲ء میں تین گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں اس کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے

تحت ہندوستانی ریاستوں کو خودمختاری کے حقوق حاصل ہو گئے
اس طرح ہندوستانیوں کو مرکز میں بھی نمائندگی ملنے لگی۔''
(ص ۴۶)

بعدازاں گاندھی جی نے انڈین نیشنل کانگریس کے تحت ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' کا آغاز کردیا جس کا مقصد سول نافرمانی کر کے انگریز گورنمنٹ کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کرنا تھا نیز انگریز حکومت کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر فوری طور پر انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا، اِن حالات وکوائف کے مطالعے میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

صورتحال پر غور وخوض کرنے اور آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس میں ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' (Quit India Movement) کا ریزولیشن پاس کردیا گیا، اس ریزولیشن کے پاس ہوتے ہی انگریزوں میں بے چینی پیدا ہوگئی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کرلیا گیا اور پوری طرح اس تحریک کو ناکام کرنے کی کوششیں کی گئیں ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' ملک گیر سطح پر شروع ہوگئی کیونکہ عوام مقتدر لیڈروں کی گرفتاری سے مشتعل ہوگئے، ملک میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا سیاسی رہنما اس تباہ کن پالیسی کے خلاف تھے لیکن عوام کے جذبات کو نہ روک سکے، ادھر انگریزوں کے انتقام کی آگ اور تیز ہوگئی اور اندھادھند گرفتاریاں کرنے لگے۔'' (ص ۴۶)

دوسری جنگ عظیم کا دورانیہ یعنی ۱۹۴۲ء میں آزاد ہند فوج یا انڈین نیشنل آرمی تشکیل پائی تھی سبھاش چندر بوس اس کے بانیوں میں سے تھے، جس نے استعماری قوت کے خلاف، جہاد آزادی میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

یہی وہ زمانہ تھا جب نیتا جی سبھاش چندر بوس کے دل میں آزاد ہند فوج کے قیام کا خیال پیدا ہوا اور ۲۶ر جنوری ۱۹۴۲ء کو انھوں نے جرمنی میں پندرہ سو ہندوستانیوں پر مشتمل آزاد ہند فوج کی تشکیل کی آہستہ آہستہ فوج کی تعداد میں اضافہ ہوگیا، اس میں جنرل شاہ نواز جمیل خاں، لیفٹنٹ ضمیر الحق میجر گورکھ سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ سبھاش چندر بوس نے اس دور کی سیاسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے برلن ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔'' (ص ۴۷)

یہاں سبھاش چندر بوس کی تقریر کا ایک اہم حصہ نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان نے ۱۸۵۷ء میں اپنی آزادی کی پہلی لڑائی لڑی تھی اور ۱۹۴۲ء میں اس نے اپنی آزادی کی آخری جنگ کا آغاز کردیا ہے، ہندوستان کی آزادی کی دیوی تمہاری منتظر ہے، اٹھو! اور آگے بڑھو، فتح و نصرت تمارے قدم چومنے کو بیتاب ہے۔''

ہندوستان میں استعماریت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں، عوام اور سیاسی عمائدین کو اپنے خواب کے تعبیری معنی نظر آنے لگے اور انگریزوں کے پیر ہندوستان کی زمین مزروعہ سے اکھڑنے لگے تھے اس صورت حال میں ۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔

اِس سیاق میں پروفیسر صدیقی نے بپن چندر کی تصنیف ''جدوجہد آزادی'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ ''برطانیہ نے آخرکار اختیارات ہندوستان کو سونپنے کا فیصلہ کرلیا تفصیلات طے کرنے ک لیے جن میں فوری اور آئندہ دونوں قسم کی تفصیلات کا فیصلہ ہوتا تھا، ایک کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا گیا مختلف تنظیمیں اور پارٹیوں کے رہنماؤں سے طویل اور تفصیلی گفتگو کے بعد کیبنٹ مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کردیا جس کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے منظور کرلیا لیکن بعد میں ان تجاویز کی توضیح میں اختلافات رونما ہوگئے لیکن ویول کی

خواہش تھی کہ درمیانی مدت کی حکومت جلد اختیارات سنبھال لے، ستمبر ۱۹۴۶ء میں کانگریس نے حکومت بنالی جواہر لعل نہرو مجلس وزراء کے سربراہ تھے۔ اکتوبر میں مسلم لیگ بھی کابینہ میں شامل ہوگئی لیکن انھوں نے آئین سازی کے کام میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ زیادہ سے زیادہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ ہندوستان کو اختیارات سونپ دے گا۔''

زیر نظر باب کے آخیر میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ۲ر جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستان کے سیاسی لیڈران کے مابین ایک تاریخ ساز اجلاس کا آغاز کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''لارڈ ماؤنٹ بیٹن اگست ۱۹۴۷ء ہی میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے حق میں تھا مسلم لیگ اور کانگریس میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک مصالحتی منصوبہ تیار کیا اور اختیارات کی منتقلی کو ایک سال اور قریب تر لے آیا، برطانوی حکومت نے بڑے غور وخوض کے بعد مایوس ہوکر ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کردیا، اس اعلان کو ہندوستان تمام جماعتوں، سیاسی، لیگی اور کانگریسی رہنماؤں نے منظور کرلیا اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کے ساتھ دو الگ الگ ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔'' پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی زیر نظر تحقیق اس اعتبار سے منفرد ہے کہ موصوف نے آزادی ہند سے متعلق حالات وکوائف کا بہ نظر غائر مطالعہ پیش کیا ہے نیز طلبہ اور تاریخ ہند کے شائقین کے لیے مجمل انداز بیان میں مکمل تاریخ آزادی ہند کو سمیٹ دیا ہے۔

❁❁

باب سوم: تحریک آزادی اور اُردو ناول

تحریک جنگ آزادی، ایک ایسی جدوجہد تھی جس میں بلا امتیاز قوم و مذہب عوام نے حریت پسندانہ جذبے کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی پوری طاقت و توانائی صرف کر دی اور کر انگریزوں سے حصول آزادی کے لیے برسر پیکار ہوئے، اِس جنگ آزادی میں اُردو ادب کی خدمات بھی قابل اعتنا ہیں شاعروں، ادیبوں صحافیوں نے اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر وطن کی آزادی کے لیے آواز بلند کی اور عوام کے ذہنوں کو بیدار کیا خاص طور پر اُس دور کی ادبی تخلیقات اِس بات کی ترجمانی کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تصنیف ''تحریک آزادی اور اُردو نثر'' کا تیسرا باب تحریک آزادی اور اردو ناول نگاری سے متعلق ہے۔ موصوف نے اِس باب میں ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر آزادیٔ ہند تک اُن ناول نگاروں کی تخلیقی کاوشوں کا احاطہ کیا ہے جن میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر آزادی کی جدوجہد اور اُس کے فروغ کو موثر بنانے کے اِشارے ملتے ہیں۔ اِس سیاق میں بالخصوص پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سجاّد ظہیر، عزیز احمد وغیرہ کے ناولوں کو زیر غور لایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ باب میں صرف اُنہیں ناولوں کو پیش نظر رکھا گیا جن میں سیاسی موضوعات کا ذکر، متن یا بین المتن یا جملوں و الفاظ کی گہرائی میں مطرز ہے نیز مصنف نے تحریک آزادی کا تذکرہ حقیقی یا مجازی معنی میں کیا ہے۔ پروفیسر صدیقی تمہید میں لکھتے ہیں:

جنگ کی ناکامی کے چند برس بعد سرسید احمد خاں نے علی گڑھ

> تحریک کی ابتدا کی، اِس تحریک میں شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک اور ذکاء اللہ کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں ان تمام ادیبوں اور شاعروں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے اپنے میدانوں میں قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ حالی نے تنقید نگاری، شبلی نے تاریخ نویسی اور ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کو ذریعہ اظہار بنایا۔''
>
> (ص۵۰)

اُردو کے تخلیقی ادب نے تحریک آزادی کو مہمیز کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، قلم کاروں نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر ایسے فن پارے تخلیق کیے جن میں اُس دور کے سیاسی ہیجانات و اثرات بے حد نمایاں اور جذبہ حریت و مقصد نظر آتا ہے۔ اِس حوالے سے پروفیسر نے یوں روشنی ڈالی ہے:

> افسانوی ادب میں عموماً براہ راست جنگ آزادی کا بیان اور سیاسی مسائل پر اظہار خیال نہیں ملتا البتہ الفاظ کی گہرائی میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس کا احساس ہوتا ہے۔ اردو ناول نگاروں میں بھی حب الوطنی کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ تھی۔ انھوں نے اپنے فن کی حدود میں رہتے ہوئے اس جذبے اور تڑپ کا اظہار کیا ہے اور اپنے ناولوں کے وسیلے سے قومی شعور کی بیداری میں جو رول ادا کیا ہے وہ نمایاں نہ ہوتے ہوئے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔''(ص۵۱)

۱۸۵۷ء کی ناکامی اور سقوط دہلی کے بعد مسلمانان ہند کی فوز و فلاح کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ عرف عام میں علی گڑھ تحریک سے موسوم ہیں۔ اِس تحریک سے ڈپٹی نذیر احمد بھی وابستہ ہوئے، انھوں نے اس تحریک کے زیر اثر اصلاحی اور تمثیلی ناول تخلیق کیے۔

اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے افتخار احمد صدیقی کی تصنیف اردو ناول نگاری سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''مولوی نذیر احمد کے رجحانات و تصورات تقریباً وہی تھے جو سرسید احمد خاں کے رفقا کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔اصل جذبہ اور محرک کی اصلاح اور ترقی کا خیال تھا اور ان کے تمام قصّوں میں مقصدی اور اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہیں۔ان کی مقصدیت ایک خاص دور کے تقاضوں اور تحریکوں سے تعلق رکھتی ہے۔''

ناول ''بنات النعش'' کی اشاعت ''مراۃ العروس'' کے تین سال بعد عمل میں آئی،اس کا موضوع خانہ داری کی تربیت،اخلاق اور حصول تعلیم ہے،اس متعلق پروفیسر صدیقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> نذیر احمد حصول علم کو حصول آزادی کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں ان کے اس قسم کے خیالات اور نظریات ان کے ناولوں میں مل جاتے ہیں بنات النعش میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تم کو معلوم ہو کہ ابتدا ان لوگوں کی کیا تھی،رومیوں کی سلطنت تھی انہیں سے انگریزوں نے عقل وسلیقہ سیکھا یہاں تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔''(ص۵۲)

ڈپٹی نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' ایک دلچسپ تخلیق ہے جو''فسانہ مبتلا'' کے کئی سال بعد شائع ہوا تھا۔اس ناول میں انگریزی معاشرت کی اندھادھند تقلید کی مذمت ملتی ہے۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے معین عقیل کی کتاب ''تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ'' سے بہت اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے ''ابن الوقت'' میں خانگی زندگی سے بحث کرتے ہوئے قومی زندگی کے مسائل اور رجحانات سے بحث کی ہے۔ابن الوقت میں فصل دوم سے فصل ششم تک جنگ آزادی کے واقعات اور اس کے عواقب کا بیان نذیر احمد کے عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔اس کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے

حکومت کی کمزوریاں اور حکام کی زیادتیاں بھی کھلے لفظوں میں بیان کی ہیں۔''

اس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے ناول ''ابن الوقت'' سے ایک اقتباس درج کیا ہے جس کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول میں تین مسلح کرداروں کے مابین غدر سے متعلق گفتگو اور دھماکے میں انگریزوں کی لاشوں کا بیان ملتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ اُس وقت ہندوستانیوں کے دلوں میں سامراجی استبدادیت کا کتنا خوف تھا۔

> ''غدر کے چوتھے دن کا ذکر ہے کہ ابن الوقت دوگھڑی دن رہے آخری کھیپ روانہ کرنے کے بعد قطعے کی طرف چلا آرہا تھا، ایک آپ تھا اور دو نوکر، تینوں مسلح اور ان دنوں جب دو آپس میں مذکور کرتے تھے تو بھی غدر کا مذکور ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی اس طرح تذکرہ کرتے چلے جاتے تھے جوں ہی محسن خاں کے کٹڑے سے آگے بڑھ کر اُس کھلے ہوئے میدان میں پہنچے جو میگزین اور کالج کے درمیان میں واقع تھا، دیکھتے کیا ہیں کہ بائیں طرف انگریزوں کی کچھ لاشیں پڑی ہیں، یہ دیکھ کر ابن الوقت کا کلیجہ دھک سے ہوگیا، اس وقت وہ موقع تھا کہ اکیلا کیسا ہی کوئی سورما کیوں نہ ہو، ڈر کے مارے گھگی بند جاتی! معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر بڑا عذاب آنے والا ہے۔''(ص۵۲)

ناول ''ابن الوقت'' کے مذکورہ بالا اقتباس کے حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے خیالات اس طرح قلم بند کیے ہیں:

> مندرج بالا اقتباس میں غدر کے حالات و کوائف کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت عوام کے دلوں میں انگریزوں کی کتنی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔''(۵۳)

بیسویں صدی یا اس عہد کے ادبی رجحانات کا جائزہ لینے سے پہلے اس دور کی سیاسی

سماجی اور تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ آیا جو مخصوص رجحان پروان چڑھ رہے تھے، ساتھ ہی اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ رجحان یکبارگی معرض وجود میں نہیں آئے۔ یوں تو بیسویں صدی سے قبل بھی انگریزی اقتدار کے خلاف وقتاً فوقتاً بغاوتیں سر اٹھاتی رہی تھیں۔

تحریک آزادی سے متعلق ایسے ناول معرض وجود میں آئے جو اپنے عہد کی تمام سیاسی گہما گہمی کا آئینہ ہیں۔ ان ناولوں کے کردار اجنبی طاقتوں کے ظلم اور غیر ملکی استبدادیت کے دیرینہ قلعوں کو مسمار کرنے کے طلب گار معلوم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> بیسویں صدی کے اوائل میں قومی نظریات و رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں، نئی تحریکوں نے جنم لیا، تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء پہلی جنگ عظیم کا آغاز ۱۹۱۴ء ہوم رول لیگ تحریک ۱۹۱۷ء اِن سب کی بدولت یہ دور سیاسی و سماجی اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب پریم چند نے اردو افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں باضابطہ قدم رکھا، پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں انھوں نے کم و بیش ایک درجن ناول تخلیق کیے جو اردو کے افسانوی ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔'' (ص ۵۳)

پریم چند کے ناولوں کا بہ نظر غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کا ذہنی سفر انیسویں صدی کی آخری دہائی سے شروع ہو کر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے اور یہ سفر تقریباً نصف صدی کو محیط ہے۔ اس دورانیہ میں ہندوستان کی قومی و سیاسی اور اقتصادی زندگی میں زبردست انقلاب رونما ہوا جس سے متضاد حالات و کیفیات کا ایک دوسرے

سے ٹکراؤ ملتا ہے۔ پریم چند نے جب اپنا ادبی سفر شروع کیا تو اس عہد کا ہندوستان اصلاحی اور انقلابی سرگرمیوں میں سرگرداں ہونے کے باوجود متعدد قسم کے تضادات کا شکار تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں پریم چند نے افسانہ اور ناول کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی پریم چند کی ناول نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں، پریم چند کے ناولوں میں محنت کش عوام، مظلوم کسانوں اور متوسط طبقے کے افراد کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک فنکار تھے جنھوں نے سماج کا بہت قریب سے مطالعہ کیا، افراد کی زبوں حالی اور مصائب کو بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کی نگاہ سائنٹفک اور معروضی تھی، پریم چند کی تصانیف اپنے عہد کے معاشی، تہذیبی اور بالخصوص سماجی زندگی کی ترجمان ہے۔'' (ص۵۴)

پروفیسر صدیقی اُس دور کے ناگفتہ بہ سیاسی حالات اور ہندوستانی عوام میں مضطربہ کیفیت اور ان کے محرکات پر گفتگو کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> پریم چند کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا ہیجان انگیز تھا، عوام میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ انقلاب روس، پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ، برطانوی اقتدار کے خلاف عوام بیزاری، محنت کش عوام کی زبوں حالی اور متوسط طبقہ کی بیداری۔ پریم چند نے اِن تمام مسائل کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔'' (ص۵۴)

اس سلسلے میں پروفیسر صدیقی نے آل احمد سرور کے مقالہ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے پریم چند کے ادبی رجحان پر جامع گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''پریم چند کے ناول سماجی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ ہر مسئلے پر ہمہ جہتی روشنی ڈالتے ہوئے چلتے ہیں ان کی تحریروں میں تاریخیت کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی شامل رہتی ہے۔ وہ ہمیں

ہمارے سماج کے ہر طبقے، ہر پیشہ اور ہر عمر کے آدمیوں، رسم و رواج، بود و باش کے طریقوں، خیال و عمل کی مختلف تحریکوں اور دیگر متعلقات حیات سے واقفیت کرا کے ہماری معلومات بڑھاتے ہیں۔ مقامی رنگ ان کے ناولوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے لکھتے ہیں۔''

پریم چند بنیادی طور پر طبقاتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ فرد کی آزادی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کی رومانیت پر وطن پرستی کا رنگ غالب ہے جس کا اظہار ان کی ابتدائی کہانیوں میں ملتا ہے۔ اُن کا تصور، رومانوی اثرات کے ساتھ تلخ حقائق کا اظہار کرنے سے کتراتا ہے کیونکہ ان کا تصور محبت، سماجی روایت سے منسلک ہے جس میں محبت کے کئی رنگ موجود ہونے کے ساتھ، حب الوطنی، دبے کچلے طبقات سے ہمدردی، مادی حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، پریم چند کے اِس پہلو پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> پریم چند محبّ وطن تھے، انہیں اپنے وطن کی ہر چیز سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا۔ ان کے ناول اپنے عہد اور خصوصاً بیسویں صدی کے سیاسی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے بہترین ترجمان ہیں۔ پریم چند کو اپنے وطن سے عقیدت تھی، ان کے ناولوں میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے پریم چند گاندھی جی کے ارادت مندوں میں تھے اور گاندھی ازم میں یقین رکھتے تھے۔'' (ص۵۴تا۵۵)

اِس سلسلے میں پروفیسر صدیقی ماہنامہ ''زمانہ'' کے شمارہ (پریم چند نمبر) سے دیانارائن نگم کے مضمون کا اقتباس نقل کیا ہے جس میں دیانارائن نگم پریم چند کی حب الوطنی اور حقیقت پسندی (Realism) پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''وہ سچے محبّ وطن اور کامل ادیب تھے اور فن میں کامل وہی ہوسکتا ہے جس کا دل وسیع، نگاہ بلند، طبیعت بے ریا اور نیت صالح ہو، جوز بردست نہ ہو بلکہ ادنیٰ و اعلیٰ ہر ایک کا ہمدرد ہو، ہر حال میں بے لوث رہ کر زندگی کے حقائق سے واقفیت رکھتا

ہو۔'' اس حوالے سے عبدالماجد دریا آبادی کے مضمون کا اقتباس بھی بہت اہم ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''لوگ قصّے کہانیوں کو محض لطف وتفریح کے لیے پڑھتے ہیں لیکن اس کے لطف کے ساتھ اگر نفع بھی منظور ہوتو بدی کی مخفی راہوں کا علم ،شیطنت کی چالوں کا احساس اور وطن کا صحیح جذبہ ایثار وخلوص اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہوتو ایسی شیریں خوشگوار کونین پریم چند کے دواخانہ میں ہی دستیاب ہوسکتی ہے۔''

پریم چند کے کردار اکثر معاشرے کے ستائے ہوئے عام لوگ ہیں،انھوں نے مظلوم دبے کچلے فرد، بالخصوص دیہاتوں میں جاگیرداروں اور مہاجنوں کے ظلمؤ کے مارے لوگوں کو زبان دی ان کے اندر آزادی کی تڑپ اور جدو جہد کا جذبہ بیدار کیا اور ایک نئی دنیا کا تصور پیش کیا طبقات سے آزاد معاشرے کا وجودان کا بنیادی نظریہ تھا۔

پریم چند کا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں معرض وجود میں آیا جس میں انھوں نے آزادی،حریت،غلامی اور بغاوت جیسے حساس موضوعات کو چھیڑا تو برطانوی حکومت نے اُس پر پابندی عائد کردی افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں پریم چند سیاست سے متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ یہ تحریکوں کا دور تھا۔تحریک خلافت،تحریک عدم تعاون،تحریک ستیہ گرہ،سول نافرمانی وغیرہ ہندوستانی عوام ملک سے ظلم واستبدادیت کا خاتمہ کے درپے تھے،لہٰذا پریم چند سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے بعد قلم کے ذریعے اس مہم میں شامل ہوئے اور سرکاری ملازمت سے مستعفیٰ ہو گئے گوکہ پریم چند سیاسی شخصیت نہیں تھے،البتہ وہ سماجی موضوعات کے ساتھ،سیاسی موضوعات پر بھی کھل کر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے،اسی لیے اُنھوں نے سرکاری ملازمت کو ترک کیا۔اُن کے اُس دور کے فن پاروں میں سیاسی کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے پریم چند کے سیاسی رجحانات کی تسطیر میں،اُن کے سیاسی مراتب کا تعین اِس طرح کیا ہے:

پریم چند،گاندھی جی سے متاثر ہوکر اور عدم تعاون کی تحریک کے
زیراثر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گاندھی جی کے ساتھ
آزادی کی تحریک میں اپنی تحریروں اور ناولوں کے ذریعہ حصہ لیا

''گوشۂ عافیت''اور''میدان عمل'' گاندھی جی کے نظریات و خیالات کی نمائندگی کے لیے لکھے گئے ۔بالواسطہ طور پر پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعے گاندھی جی کے خیالات کو تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچانے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پریم چند گاندھی جی کے نظریات سے براہ راست متاثر تھے ،وہ اپنے ایک ناول ''جلوۂ ایثار'' میں ایک کردار کی زبان میں کہتے ہیں :''مجھے ایک بیٹا دے اے دیو ماتا۔ دیوماتا نے پوچھا، جو بہت دھنوان ہو ،بلوان ہو اور دنیا بھر میں شہرت حاصل کرے۔''

''لیکن ماں نے کہا'' نہیں مجھے ایسا بیٹا دے جو وطن کی خدمت کرے۔''(ص۵۶)

ناول''میدان عمل''،جس کا شمار پریم چند کے کامیاب اور مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے یہ ناول ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں متوسط طبقے کے نوجوانوں ،کاشتکاروں مزدوروں اور دوسرے تمام افراد کی قومی جدوجہد کو فنکارانہ مہارت سے پیش کیا گیا ہے،اگر یہ کہا جائے کہ یہ ناول تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے تو غلط نہ ہوگا،اس میں تحریک آزادی سے متعلق عوامی عمل اور ردّعمل کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے جو صرف ایک بلند خیال ادیب ہی پیش کرسکتا ہے۔تکنیکی اعتبار سے بھی میدان عمل پریم چند کے دیگر ناولوں سے بہتر ہے ،اس ناول میں پریم چند ایک نئی منزل کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔ پروفیسر صدیقی ''میدان عمل'' کے موضوعی حوالوں کا سراغ لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

پریم چند کے ناول ''میدان عمل''میں اس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور عوام میں غیر ملکیوں کے خلاف باغیانہ رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔''میدن عمل''میں اس وقت کے

ہندوستان کی سیاست اور حکمراں طبقے کے مظالم کا ذکر بھی ملتا ہے۔اس ناول کے تمام کردار انگریزوں کے مظالم اور غیر ملکی حکومت کے بے جا تسلط کے طلب گار ہیں اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (ص۵۶)

پریم چند کا ایک اور شاہکار ناول ''چوگان ہستی'' ہے جس کی اشاعت ۱۹۲۴ء میں عمل میں آئی اردو کا کوئی دوسرا ناول موجود نہیں جو''چوگان ہستی'' کے معیار کو چھو جاتا۔ پریم چند نے خود بھی مذکورہ ناول کو اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔اس ناول کی تخلیقی اور فنکارانہ قوتیں اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی معلوم ہوتی ہیں ۔''چوگان ہستی''میں صنعتی تہذیب سے جنم لینے والے مسائل کو موضوع بنایا ہے پریم چند گاندھی جی کی طرح صنعتی تہذیب کے فروغ سے بے حد متفکر اور خوف زدہ تھے ،ان کا خیال تھا کہ صنعتی ترقی سے ہندوستان کی مالی و اقتصادی حالت میں سدھارلانا ممکن نہیں کیونکہ ہندوستان کے عوام جو زیادہ تر گاوؤں میں بستے ہیں،شہر اور دیہات کی کشمکش میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

''چوگان ہستی'' جو ۱۹۲۴ء میں تخلیق کیا گیا،اس کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے ،یہ دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ناول بھی اپنے عہد کی سیاسی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔اس میں پریم چند نے مختلف کرداروں کی زبان سے گاندھی جی کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کی ہے،''چوگان ہستی'' میں رانی جانسھوی کا کردار بڑا اہم ہے،وہ اپنے لیے ایک ایسے بیٹے کی خواہش کرتی ہے جو محبِّ وطن ہو اور ملک وقوم کی خدمت میں اپنی جان تک قربان کردے۔وہ بیٹے کی موت پر تقریر کرتے ہوئے کہتی ہے:

''میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے کوئی
ایسا ہی سپوت دیتا جو انہیں جانبازوں کی طرح موت سے
کھیلتا جو اپنی زندگی کو ملک و اقوم کی خدمت میں قربان
کر دیتا۔''(ص ۵۷)

''چوگان ہستی'' میں آزادی سے قبل کے حالات نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں اور اس حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

''چوگان ہستی'' میں آزادی سے قبل کے حالات، سماجی اور
معاشی پہلوؤں سے بحث ملتی ہے اور گاندھی جی کی تحریکوں کی
جھلک بھی اس ناول میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔''(ص ۵۷)

''گئودان'' ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۵ء کے دوران میں تخلیق کیا گیا ایک بہترین ناول ہے بلکہ پریم چند کو ابدیت عطا کرنے کی پوری قوت رکھتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے پریم چند کی دیہی زندگی کے تمام تر مطالعات و مشاہدات کا نچوڑ ہو جو کاشتکاروں کی بے بسی اور کسمپرسی کا نوحہ ہے نیز گئودان میں اپنے عہد کے سیاسی حالات و کوائف سے بھی بحث ملتی ہے، جس کے حوالے سے پروفیسر صدیقی یوں گویا ہوئے ہیں:

''گئودان'' پریم چند کا معرکۃ الآرا ناول ہے جس نے نہ صرف
اردو بلکہ پورے ہندوستانی ادب میں اپنی اہمیت اور
قدر و قیمت کا لوہا منوایا۔اس میں اُس دور کے سیاسی
موضوعات اور مسائل سے بحث ملتی ہے ''گئودان'' کے کردار
آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں اور اپنے وطن سے والہانہ
محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔''(ص ۵۷)

اس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے معین عقیل کی تصنیف ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں معین عقیل لکھتے ہیں کہ ''یہ ناول اپنے دور کے مختلف

اقتصادی اور سیاسی انقلابات کو پیش کرتا ہے ،اس کے کرداروں میں کسان، زمیندار، شہر کے باشعور افراد، قومی تحریک کے کارکن سبھی ہیں جو حکام بالا دست سے نہیں ڈرتے اور ملک کی آزادی کو عملاً ظاہر کرتے ہیں۔''

اسی سیاق میں یوسف سرمست کی تصنیف ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' سے ایک اور اقتباس نقل کیا گیا ہے جس میں یوسف سرمست پریم چند کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''پریم چند اپنے عہد کی سیاسی اور معاشی حالات سے براہ راست وابستہ رہے ہیں۔ پریم چند نے ساحل سے طوفان کا نظارہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفان سے تھپیڑے بھی کھائے ہیں۔''

اِس ضمن میں پروفیسر احتشام حسین کا اقتباس بہت اہم ہے جسے پروفیسر صدیقی نے ان کی تصنیف ''ذوق ادب وشعور'' سے نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''انڈین نیشنل کانگریس سے تو انہیں فکر کے ذریعے اصلی غذا ملتی تھی لیکن وہ دوسری سماجی و اصلاحی تحریکوں سے بھی غذا لیتے تھے چنانچہ راناڈے وغیرہ کی سماجی اور اصلاحی تحریکوں کا عکس، اُن کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی پریم چند کی ناول نگاری کو موضوع کے اعتبار سے دو اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مریم چند کے ناول دو اقسام میں منقسم ہیں، پہلے قسم کے ناولوں میں ہندوؤں کے معاشرتی حالات اور مقاصد کی اصلاح کا عنصر ملتا ہے اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے، اس قسم کے ناولوں میں ''جلوہ ایثار، بازار حسن، پردۂ مجاز، غبن'' اور ''نرملا'' شامل ہیں۔ پریم چند کے دوسرے قسم کے ناولوں کے موضوعات اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہیں ان میں معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔'' (ص ۵۹)

۱۹۱۷ء انقلابِ روس تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے، اِس واقعہ نے پوری دنیا کو متاثر کیا اور دیگر ممالک کی طرح ہندوستان نے بھی اِس واقعے کے گہرے اثرات قبول کیے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد میں کسی قدر تیزی آئی، دوسری جانب ہندو مسلم اختلاف میں بھی اضافہ ہوا اِن حالات اور سیاسی کشمکش کے سبب مایوسی کی فضا چھانے لگی، جس کی بنا پر حساس نوجوان طبقہ میں اشترا کی رجحانات فروغ پانے لگے، اُس عہد کے شعرا اور ادبا کے فن پاروں میں لینن اور کارل مارکس کے اثرات نمایاں طور نظر آتے ہیں۔

جولائی ۱۹۳۵ء پیرس میں بعض شہرہ آفاق شخصیات، جن میں روماں رولاں، ٹامس مان اور آندرو مالرو نے ثقافت کے تحفظ و بقا کے لیے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی، اِس کانفرنس کا نام ''دی ورلڈ کانگریس آف دی رائٹر فار دی ڈیفینس آف کلچر'' (The World Congress of the (Writer for the defence of culture تھا۔ اگرچہ ہندوستان سے کسی بڑے ادیب نے مذکورہ کانفرنس میں شرکت نہیں کی البتہ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے ہندوستان کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے تھے۔ بعد ازاں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے دیگر ہندوستانی طلبہ کے تعاون سے ''ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد رکھی۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ترقی پسند تحریک کے قیام اور اس کے محرکات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ترقی پسند تحریک کی جہاں ابتدا ہوتی ہے وہاں پریم چند کا دور ختم ہو جاتا ہے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ۱۹۳۵ء میں لندن میں عمل آیا لیکن اس نے باضابطہ تحریک کی شکل ۱۹۳۶ء میں اختیار کی، اس انجمن کے قیام کے سلسلے میں سجاد ظہیر کا نام خاص طور پر سامنے آتا ہے، علاوہ ازیں محمد دین تاثیر، محمد علی ملک راج آنند اور جیوتی گھوش وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب آزادی کی جدوجہد اپنے شباب پر تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اصل محرک سجاد ظہیر ایک نوجوان تھا۔ اس انجمن

کی پہلی کانفرنس ۱۰/اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی اور منشی پریم چند نے اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

(ص۶۰)

وہ ادیب جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے نظریات کو حکمت و تدبر کے بعد اپنی فکری تربیت میں احساس کا حصہ بنایا اور فنّی خلوص کو مارکسی نظریے کے ساتھ آگے بڑھے؛ اُن کے حوالے سے پروفیسر صدیقی اپنا تنقیدی نقطۂ ہائے نظر اِس طرح بیان کرتے ہیں:

ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد پریم چند کا دور ختم ہو گیا اور ادب کی باگ ڈور براہ راست ترقی پسند مصنفین کے ہاتھوں میں آ گئی ۱۹۳۶ء کے ادب نے ایک نیا موڑ لیا، خیالات اور رجحانات اور نظریات میں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں اور جدید طرز کا ادب تخلیق کیا جانے لگا، اِس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر کرشن چندر، عصمت چغتائی، مرزا سعید، اپندر ناتھ اشک عزیز احمد، رشید اختر ندوی، رشید جہاں، فضل قریشی، اشرف صبوحی انصار ناصری، ظفر قریشی، نجم الدین شکیب وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ان کے ناول واقعات سے قطع نظر ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار اور اضطراب کے پیدا کئے ہوئے کرداروں پر مبنی ہیں۔یہ کردار اپنے دور کے سیاسی انتشار کا عکس ہیں۔اُن کرداروں کے ذہن بے شمار اور مستقل الجھنوں کی آماجگاہ ہیں، یہ الجھن اُن کے ماحول کی دی ہوئی ہیں اور سیاسی نظریات، معاشی تصورات اور جنسی محرکات کی باہمی کشمکش اور تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔اُس دور کے ناول نگاروں نے ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں ادب کو تخلیق کیا

اس دور میں تخلیق کیے گئے ناولوں میں کرشن چندر کا ناول
''شکست''، سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات''، عصمت
چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر'' اور عزیز احمد کا ''گریز'' سامنے آتے
ہیں۔'' (ص ۶۱)

کرشن چندر ایک زود نویس قلمکار تھے، جن کی پہچان فکشن کی دنیا میں بطور اشتراکیت کے طرفداروں میں ہوتی ہے، گو کہ کرشن چندر بنیادی طور پر رومانیت پسند تھے البتہ سماجی طور پر ناانصافیاں، انقلاب کا شدید احساس، انسانیت کی مظلومیت ومحکومیت، اُن کے فن پاروں میں رومانیت کے انداز میں ملتے ہیں اور مجموعی طور پر کرشن چندر کا فن رومانیت (Romanticism) اور ترقی پسندی (Progressivism) کا حسین امتزاج ہے۔

کرشن چندر کا پہلا ناول ''شکست'' ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آیا جو کشمیر سے جڑی یادوں کو تازہ کرتا ہے لیکن یہ ناول ۱۹۳۶ء کے بعد رونما ہوئے سیاسی بحران کا بھی منعکس ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر صدیقی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

کرشن چندر کا ناول ''شکست'' ۱۹۳۶ء کے بعد سیاسی بحران کا
آئینہ دار ہے۔ اس ناول میں کے کرداروں میں حب الوطنی اور
وطن پرستی کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اپنی ملک کی خاطر جان کی
بازی لگا دینے کو تیار ہوں لیکن ان سب حقائق کا اظہار براہ
راست ناولوں میں نہیں ملتا۔'' (ص ۶۱)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ناول ''شکست'' سے ایسے کئی اقتباس نقل کیے ہیں جن کی رو سے ۱۹۳۶ء کے بعد رونما ہونے والے سیاسی بحران اور ناول کے مرکزی کردار شیام اور علی کی باہم گفتگو سے وطن پرستی کا جذبہ منعکس ہوتا ہے۔

کرشن چندر کیونکہ طبعی اعتبار سے رومان پسند تھے، ان کی ابتدائی شہرت ومقبولیت کی وجہ اُن کا رومان پرور طرزِ نگارش تھا لیکن اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ زیادہ دیر رومانی فضا میں گم نہیں

ہوئے اور اس فضا سے نکل کر اپنے خیالات اور نظریۂ فکر میں اشتراکیت پسندوں (Socialists) کی جماعت میں شامل ہوگئے اور معاشرے کے عروج ،جمہوریت اور مساوات میں یقین رکھنے لگے۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاءالرحمٰن صدیقی نے اپنا زاویۂ نظر اس طرح بیان کیا ہے:

> کرشن چندر کے خیالات اور نظریۂ فکر سوشلسٹ تھا وہ جمہوریت اور مساوات میں یقین رکھتے تھے ۔کرشن چندر کی تخلیقات ہندوستان کے سیاسی بحرانی دور میں تصنیف کی گئیں اس دور کے ناولوں میں خلوص و یگانگت ،حب الوطنی اور انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے۔''(ص۶۲)

سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات''اردو ناول نگاری کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس ناول سے اردو میں جدید ناول نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔''لندن کی ایک رات'' کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں داخلی خود کلامی کے ذریعے جس طرح کردار سازی کی ہے ،اس سے ملک ، سیاست اور وطن پرستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے ۔اُس دور میں ہندوستان جن بدترین و دشوار کن اور منتشر حالات سے گزر رہا تھا اور جو خیالات نوجوانوں کے ذہنوں میں پرورش پا رہے تھے ،اُن کا واضح عکس ''لندن کی ایک رات'' میں محسوس ہوتا ہے۔اُنہیں سیاسی حالات و کوائف کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے محرک اور روح رواں تھے ،ان کا ناول ''لندن کی ایک رات'' ۱۹۳۷ء میں منظر عام آیا جو ادبی سے زیادہ تاریخی اور سیاسی ہے۔''لندن کی ایک رات'' کے ہندوستانی کردار اپنے ملک و قوم سے محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اعظم اس ناول کا ایک کردار ہے ،وہ لندن میں ایک مقام پر

کھڑا جیمس کا منتظر ہے اچانک اس کی نگاہ سامنے لگے ہوئے
چند اشتہاروں پر پڑی، اخبار میں جلی حروف میں لکھا تھا: ''بیکار
مزدوروں کا ہارڈ پارک میں جلسہ۔''
''دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار نیٹیوز کو فساد کرنے سے روکا
ایک گورا زخمی ہوا اور ۱۵ نیٹیوز کی جان گئی، بڑے بڑے کوئی
ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ
حرفوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اعظم کا خیال ایک لمحے کے لیے
اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر ہندوستان وطن کی طرف
گیا: ''یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم
ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں ''نیٹیوز'' ہم نیٹیوز ہیں اور لال منہ
بندر جو اس ملک میں رہتے ہیں، یہ کون ہیں۔؟'' (ص ۶۲)

پروفیسر صدیقی نے اِس ضمن میں ''داستان سے افسانے تک'' سے وقار عظیم کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اس ناول کا انداز سرتاسر فکری ہے اور اس فکری انداز نے ہندوستان اور اس باہر کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے۔''

اس حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی کا اقتباس بھی بہت اہم ہے جس میں انھوں نے ''لندن کی ایک رات'' کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعے ہندوستان کے متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے نوجوانوں کی عکاسی کی اور اس طور اپنے دور کے سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ''لندن کی ایک رات'' میں کردار سازی اور نوجوانوں کے قلب و ذہن میں پرورش پا رہے جذبہ حریت کو اس طرح واضح کیا ہے:

''لندن کی ایک رات'' کے کردار اپنے ملک کو آزاد کرانے میں
کس درجہ کوشاں ہیں۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں اور

ہندوستانیوں کے تئیں بڑی محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' کے کردار بے چینی اور کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں اور غلامی سے نجات کے طلب گار ہیں۔ وہ سماجی جکڑ بندیوں اور حکمراں طبقے کی غلامی سے نجات پانا چاہتے ہیں اور آزاد زندگی گزارنے کے متمنی ہیں۔'' (ص ۶۴)

جدید اردو فکشن، جس کی بنیاد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پڑی، اس میں عصمت چغتائی کا نام بہت اہم ہے، انھوں نے اُردو ناول نگاری کی عام روش کو جو اعجاز و اعزاز فراہم کیا، وہی وصف اور تخلیقی ارتقاع عصمت چغتائی کو وقار و امتیاز عطا کرتا ہے۔

عصمت کے ناولوں کے موضوعات محض مسلم گھرانوں کے متوسط طبقے کی زندگی اور اُن کی ناگفتہ بہ صورت حال ہی نہیں بلکہ اُس میں مذہب، زمینداری، ہندو مسلم اتحاد، اُن کے باہمی جھگڑے، نوجوان، غنڈے، ہندوستانی گالیاں ،نسائی لب و لہجہ اور نسائی محاوروں کے علاوہ سیاست بھی ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں میں براہ راست سیاسی موضوعات کو نہیں برتا البتہ بالواسطہ طریقے سے سیاسی موضوعات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''ٹیڑھی لکیر'' سے سیاسی رنگ تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترقی پسند ناول نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ سماجی اور سیاسی ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی برائیوں کے ساتھ ساتھ معاشی بدحالی اور بے راہ روی ملتی ہے۔ ''ٹیڑھی لکیر'' ۱۹۳۶ء عصمت کا بہترین ناول ہے عصمت نے ''ٹیڑھی لکیر'' میں زندگی اور سماج کو موضوع بنا کر سیاست سے بحث کی ہے۔ اس ناول کے نصف آخر میں ہندوستانی سیاست سے خاص بحث کی گئی ہے، اس کے کردار اپنے وطن سے محبت اور سفید فام لوگوں سے

نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔۱۹۳۶ء کے بعد کا زمانہ ہندوستان
میں سیاسی اعتبار سے بڑا ہیجان انگیز زمانہ تھا۔عصمت بھی ان
سیاسی تحریکات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں،انھوں نے اس
کا اظہار اپنے ناولوں کے ذریعے کیا ''(ص ۶۵)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے خیالات کے تناظر میں ناول ''ٹیڑھی لکیر'' سے ایک ایسا اقتباس نقل کیا ہے جس سے ناول کے مرکزی کردار شمن کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے:

ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا، یہ
بغاوتیں ریل کے ڈبوں میں پورے زوروخروش سے رونما
ہوئیں،سفید فام قوم کو کھلا حکم مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے
نہیں مانگتے تم کو،ورنہ بسیں جلا ڈالیں گے ریل کی پٹریاں اکھیڑ
دیں گے۔''(ٹیڑھی لکیر:ص ۴۲۳)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ناول کے مرکزی کردار شمن اور بٹلر کے تعلق اور دونوں کی باہم گفتگو کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شمن اور بٹلر کے درمیان محبت ہونے کے باوجود شمن کے دل
میں سفید فام لوگوں کے لیے سخت نفرت ہے۔اس کے دل میں
حب الوطنی کا جذبہ برابر کام کر رہا ہے۔ایک سفر کے دوران شمن
اور بٹلر میں سیاسی مسائل پر بحث ہو رہی ہے، شمن اگست میں
پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر کرتی ہے جو انگریزوں کے
خلاف ہندوستانیوں کا جرأت مندانہ اقدام تھا اس ناول میں
صفحہ ۴۱۴ سے لے کر ۴۱۷ تک اس دور کی تحریک آزادی کی
تحریکوں سے بحث کی گئی ہے۔''(ص ۶۵)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اُردو ناول نگاری کے میدان میں کئی انقلابی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ادب کے بدلتے منظر نامہ میں انسانی زندگی کے طرح بہ طرح مسائل ،حقیقت نگاری کے ساتھ پیش ہونے لگے۔ناول کے موضوعات میں اختراعات کے ساتھ مغربی ناول کے اثرات کو بھی قبول کیا گیا۔ پریم چند، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے ساتھ ساتھ اردو کے مشہور ناول نگاروں کی فہرست میں ایک نام عزیز احمد بھی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> عزیز احمد ترقی پسند تحریک کے حامی تھے، وہ ممتاز افسانہ نگار اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ناول نگار بھی تھے۔انھوں نے ''گریز'' ۱۹۴۲ء میں تصنیف کیا ،عزیز احمد نے ناول کے میدان میں ہیئت اور تکنیک کے کچھ خاص تجربے کیے اور اچھوتے موضوعات کو اپنے یہاں جگہ دی۔'' (ص ٦٦)

اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے وقار عظیم کی تصنیف ''داستان سے افسانہ تک'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ ناول ''گریز'' کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''گریز'' عالم گیر جنگوں کے درمیان کے پرآشوب یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے اس میں اُس عہد کے حقائق کا غلبہ ہے جنھیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ''گریز'' کے زمانۂ تخلیق، ہندوستان میں سیاسی اتھل پتھل اور کمزور پڑتی انگریزی سامراجیت کے ضمن لکھتے ہیں:

> ''گریز'' ایسے ہیجان انگیز دور میں تخلیق کیا گیا جب سلطنت برطانیہ دم توڑ رہی تھی، ہندوستان سے انگریزوں کے پیرا کھڑنے لگے تھے، انگریز حکام تذبذب اور کشمکش کے عالم میں مبتلا تھے، دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی۔ ہندوستان بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ بایں ہمہ ہندوستان میں آزادی کا

سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔"(٦٦)

اِسی سیاق میں پروفیسر صدیقی "معین عقیل کی تحریر سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں موصوف اُس دور کے سیاسی تناظرات میں "گریز" کا جائزہ اس طرح رقم کرتے ہیں کہ "گریز" پہلی جنگ اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عہد کے سیاسی اور معاشی ماحول کا ایک منتشر ترجمان ہے یہ یورپ اور انگلستان کے سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایک پرشور زمانہ کا عکاس ہے جسے پڑھ کر وہ سیاسی اور معاشی محرکات سامنے آتے ہیں جو یورپ کے زیر اثر اُس وقت کے عالمی مسائل تھے۔اس ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں جنسی نفسیات کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔"

بقول پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے، اردو ناول نگاری میں نذیر احمد سے لے کر پریم چند اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر ترقی پسند ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے ذریعے براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے عوام میں آزادی کی تحریکوں کے تئیں گرمی پیدا کی، قومی شعور بیدا کیا جس سے ہندوستانیوں کے عزم اور حوصلوں میں پختگی پیدا ہوئی۔

❀❀

باب چہارم: تحریک آزادی اور اُردو افسانہ

تحریک آزادی کی جدوجہد میں اردو کا افسانوی ادب بھی پیش پیش رہا ہے۔افسانہ طرازوں نے اپنے سیاسی ماحول سے متاثر ہوکر ایسے افسانے تخلیق کیے جن میں اُس دور کے سیاسی ہیجان اور اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی کتاب ''تحریک آزادی اور اردو نثر'' کے باب چہارم میں بعنوان ''تحریک آزادی اور اُردو افسانہ'' کو موضوع بحث بناتے ہوئے تحریک آزادی کا مطالعہ اُردو افسانوی ادب کی روشنی میں کیا ہے اور پریم چند کی گاندھی جی سے عقیدت اور تحریک آزادی سے ذہنی و عملی وابستگی کا ذکر بھی برسبیل تذکرہ موجود ہے۔علاوہ ازیں موضوع کی مناسبت سے پریم چند کے علاوہ کرشن چندر، منٹو، عصمت حیات اللہ انصاری، احمد علی کی افسانوی تخلیقات کے جائزے میں حقیقت کی توضیحات کا بیان ملتا ہے۔

اُردو افسانہ کے اِرتقا اور اس کے تخلیقی رجحانات و تناظرات سے متعلق وقار عظیم کی تصنیف ''نیا افسانہ'' سے منقول مندرجہ ذیل اقتباس بہت اہم ہے:

> ناول کی طرح اردو افسانہ بھی انگریزی کے اثر سے آیا ناول کے مقابلے میں ایک گمنام چیز بن کر رہ گیا۔مختصر افسانہ کی ابتدا ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی معاشرتی اور قومی رہنما اِس انتشار سے گھبرا کر ملک کی نئی تحریک پھیلا کر عوام میں اپنے مٹتے ہوئے تمدن کی محبت اور اُن کی جگہ

لینے والے ایک نئے نظام کی طرف سے محنت کا جذبہ
پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔''(ص ۷۰)

وقار عظیم کے وقیع خیالات ونظریات کی روشنی میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی معاشرہ پرانی قدروں کو چھوڑ کر نئے سماج قدم رکھ رہا تھا۔مختلف قسم کی تحریکیں ابھر رہی تھیں، یہی وہ زمانہ میں، تھا جب پریم چند نے کہانیاں لکھنا شروع کیں، پریم چند کی پہلی کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن''۱۹۰۷ء میں ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوئی۔''(ص ۷۰)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، پریم چند کا افسانہ ''قاتل'' کے مرکزی خیال اور کرداروں کا حسی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

افسانہ ''قاتل'' میں دھرم ویر ایک اہم کردار ہے جو ایک قوم پرست سبھا کا کارکن بھی ہے۔اس کی بوڑھی ماں محبّ وطن اور اعتدلال پسند ہے، وہ دھرم ویر کیا نتہا پسند رویے کو پسند نہیں کرتی اور اس سبھا پر مختلف طرح سے اعتراضات کرتی ہے، دھرم ویر اپنی بوڑھی ماں سے کہتا ہے: ''جو تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں، تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔''(ص ۷۰)

پروفیسر صدیقی نے مندرج بالا اقتباس کے علاوہ افسانہ ''قاتل'' سے اور بھی کئی اہم اقتباس نقل کیے گئے ہیں جن کی قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ ''قاتل'' کا مرکزی کردار دھرم ویر کی زبان میں ہندوستان کی آزادی کا سورج اسی صورت میں طلوع ہوسکتا ہے کہ اُنہیں بڑی تعداد میں ہلاک کیا جائے، جس طرح روس اور آئرلینڈ میں ہوا۔افسانہ ''قاتل'' میں دھرم ویر کی

بوڑھی ماں بھی جس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کے جرم میں زندان گزیدہ کر دیا جاتا ہے؛ بھی دل و جان سے تحریک جنگ آزادی میں شریک ہے۔''

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے اہل علم و دانش میں دو قسم کے نظریات جنم لے رہے تھے، ایک مذہبی اور تہذیبی احیائیت کے تصورات اور دوسرے مغربی، خاص طور پر انگریزی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے نظریات۔ اس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے اپنے خیالات اس طرح قلم بندے کیے ہیں:

> بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مختلف تحریکوں کو لے کر ہوا نئے رجحانات سامنے آئے اور سیاست نے نیا موڑ لیا ہندوستان کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف خطے انتشار اور بے چینی کے عالم میں مبتلا تھے۔ سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں، چین ترکی اور ایران میں بھی یہی صورت نظر آتی تھیں اسی دوران یعنی ۱۹۰۶ء میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آیا جس کا ردّعمل یہ ہوا کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے ادھر نوجوان طبقہ متحرک ہو گیا، اسی سال ہندو مہاسبھا کی داغ بیل پڑی یہی وہ دور تھا جب پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں شامل پریم چند کی کہانیوں میں حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان سے بغاوت کی بو آتی تھی جو انگریزوں کی جابرانہ عملداری کے خلاف تھی۔'' (ص۷۲)

اُردو افسانوی ادب کی وساطت سے انقلاب اور معاشرے میں تبدیلی لانے کا تصور پریم چند کے ابتدائی افسانوں ہی سے سامنے آتا ہے۔ اِس حوالے سے وہ مقصدیت کی ایسی تحریک کا تسلسل تھے جو ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور ان کے رفقا کے ہاتھوں شروع ہوئی تھی۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں حقیقت نگاری اور وطن پرستی کا جذبہ نمایاں رہا، اِس حوالے سے پریم

چند کے افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' میں شامل افسانوں میں باغیانہ خارانداز اور داخلی شعور پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''سوز وطن'' پانچ کہونیوں پر مشتمل ہے،ان کہانیوں میں ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ''شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے،صلہ ماتم ''اور حب وطن'' شامل ہیں ۔''سوز وطن'' کے افسانوں سے بغاوت کی بوتی ہے اور حب الوطنی کے جذبات ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اِس جملے پر ختم ہوجاتا ہے''وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔''یہی میرا وطن'' سب سے چھوٹا افسانہ ہے یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی حب الوطنی کا مرقع ہے جو ساٹھ برس میں امریکہ میں آرام و آرائش کی زندگی بسر کرکے اپنے وطن کے دیدار کی تمنا لے کر اپنے پیارے وطن کو واپس آیا ۔''عشق دنیا'' اور ''حب وطن'' کا موضوع بھی حب الوطنی ہے ،اس افسانے میں اٹلی کی محبّ وطن ''میری'' کی حسرت ناک زندگی کے چند عبرتناک مناظر کو بیان کیا گیا ہے جو ہندوستانیوں کے دلوں کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔سوز وطن کی کہانیوں میں ''صلہ ماتم '' کو چھوڑ کر باقی چار کہانیوں میں ہمیں ایک ایسے سچّے دردمند اور پرخلوص عاشق وطن کی روح مچلتی اور تڑپتی نظر آتی ہے جو وطن کی ہر چیز اور خصوصاً وطن کی آزادی کو والہانہ جذباتیت کے ساتھ روحانی انداز سے دیکھتا ہے۔'' (ص۷۳تا۷۴)

علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی برسبیل تبصرہ، پریم چند کے ایسے کئی افسانوں،

جن میں ''ڈامل کا قیدی، آخری تحفہ، جیل، جلوس، آشیاں برباد، منزل مقصود'' جیسے افسانوں کے کردار میں داخلی اسرار اور ان کی معنوی جہتوں پر مدلل گفتگو کی ہے۔ یہ پریم چند کے ایسے فن پارے ہیں جن میں آزادی کی تحریک، تحریک موالات، سرکاری ملازمتوں سے مستعفی ہونے کے واقعات اور گاندھی جی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے عملی وابستگی کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کتاب کے اِس باب میں ایک ضمنی عنوان ''اردو افسانہ پریم چند کے بعد'' قائم کیا ہے، جس میں پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں میں ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے فن پاروں کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور اِس سیاق میں ''عکس اور آئینے'' سے ایک اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے، جس میں پروفیسر احتشام حسین رضوی لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کے آوائل میں اپنی ابتدا ہی سے افسانہ میں یلدرم کے ہاتھوں جس رومانیت اور پریم چند کے ہاتھوں مثالیت پسندی کے باوصف جس حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی تھی وہ الگ الگ باقاعدہ رجحان بن کر مستحکم روایتیں بن چکی تھیں ''انگارے'' اور پرترقی پسند تحریک کے زیراثر حقیقی زندگی پرزیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ سماجی انتشار، قومی اتحاد، سیاسی بیچارگی، طبقاتی استحصال، امن کی خواہش، غربت او رافلاس متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار کا کھوکھلاپن، محبت پر پابندی، بیکاری، جنسی گھٹن، ایثار، قربانی کی لگن، خاندانی زندگی کی ابتری اور ایسے ہی دوسرے موضوعات سینکڑوں شکلوں میں افسانے بنے۔'' (ص۷۸)

اِس ضمن میں وقار عظیم کے خیالات بھی کافی اہم ہیں جنہیں اُن کی کتاب ''نیا افسانہ'' سے نقل کیا گیا ہے، وقار عظیم لکھتے ہیں کہ ''انگارے'' مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہے۔ انگارے کی کہانیوں میں

ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی اور ان سب کی پیدا کی ہوئی عجیب وغریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں بھی جن میں رورعایت کہیں نہیں اور آزادی اور بیبا کی، خیال ہر جگہ ہے ان کی مصوری میں تلخ طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے اور اِس تلخ طنز میں کہیں کہیں سنجیدگی اور ادبی اشاروں کے طرز چھوڑ کر تسخر اور جھنجلاہٹ اور بعض جگہ ابتذال کی شکل اختیار کر لی ہے۔''

ترقی پسند مصنفین میں جن افسانہ نگاروں کو بے پناہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ،ان میں کرشن چندر سرفہرست ہے۔ان کی افسانہ نگاری میں پریم چند کی روایت کے اثرات نظر آتے ہیں تاہم انہیں مناظر فطرت سے بھی حد درجہ لگاؤ ہے اوران کے فن پاروں میں زندگی کی تہہ داری کے گہرے اثرات کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق ،سیاسی حالات وکوائف بھی منعکس ہیں۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> افسان نگاروں میں پریم چند کے بعد سب سے زیادہ معتبر نام کرشن چندر کا ہے ۔کرشن چندر نے ناول اور افسانہ دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے،ان کے افسانوں میں خوبصورت منظر،فطرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تلخ حقیقتوں نیز سیاسی حالات وواقعات کی بھر پور تصویر کشی ملتی ہے
> (ص۸۲)

کرشن چندر کے موضوع اور تخلیقی رجحانات کے حوالے سے معین عقیل کے خیالات کافی اہم ہیں ''کرشن چندر کے انقلابی رجحانات کے زیراثر جنگ،سامراج اور فاشیت بھی موضوع بنے ہیں اوران کے موضوعات میں سماجی،،معاشی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں ایک مخصوص نظریے کے تحت انھوں نے افسانے لکھے ہیں۔ان کی تحریروں میں ہمیں جو ماحول ملتا ہے، وہ سیاسی طور پر غلام اور سماجی طور سے پسماندہ ہے اور اِن دونوں کے اسباب انگریز قوم اور سرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ ہر طرف بھوک ہے،قحط ہے اور غلامی ہے، ہر افسر ایک ظالم اور سفاک افسر ہے جسے اس ملک کے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں، یہ ماحول کرشن چندر کو انسان دوستی اور سماجی

رشتوں کو سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔''

اردو فکشن میں سعادت حسن منٹو کسی تعارف کا محتاج نہیں ،اُس کا فن عورت کی گھائل روح کی کراہ اور درد کی تھاہ پانے کا فن ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر منٹو کے کردار گوشت پوست کے عام انسانوں سے کہیں زیادہ سچے ،حقیقی ، پائیدار اور درد انگیز ہیں۔

منٹو نے پہلا افسانہ ''تماشا'' تخلیق کیا،اس افسانے میں ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کو ایک چھ سال کے بچّے کی نظر سے دیکھا گیا ہے نیز ''تماشہ'' ۱۹۱۹ء کا مارشل لا اور جلیانوالہ باغ کے خونی منظر اور جنرل ڈائر (Gr. Dyer) کے وحشیانہ مظالم کی یاد تازہ کرتا ہے۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> منٹو نے ایک خاص دور کے سیاسی معاملات و کوائف کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ،ان کے جن افسانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جو سیاسی حالات کے مکمل طور پر ترجمان ہیں اُن میں ''نیا قانون،نعرہ،شرابی،تماشا،ماتمی جلسہ،دیوانہ شاعر،سوراج کے لیے خاص ہیں۔منٹو کا افسانہ ''تماشہ ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگاموں کو پیش کرتا ہے۔''شرابی'' اس کے بعد کے واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔اس میں منٹو نے تحریک عدم تعاون کی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز اور صورت حال کو پیش کرتا ہے۔'' (ص ۸۴ تا ۸۵)

علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی منٹو کا افسانہ ''شرابی'' سے واحد متکلم بیانیہ پر مشتمل چند سطور نقل کرتے ہیں جس میں منٹو داخلی کیفیات کا اظہار، اپنی غلامی ، بے بسی اور مظلومی کا احساس کرتا ہے اِس کے علاوہ افسانہ ''نیا قانون'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> منٹو کا افسانہ ''نیا قانون'' کا مرکزی کردار منگو کوچوان ہے جو غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی عصری حالات سے باخبر اور

سیاسی طور پر بیدار نظر آتا ہے۔ منگو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ افسانہ میں ایک جگہ منگو انگریزوں کے بارے میں کہتا ہے۔ ''آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک بن گئے ناک میں دم کر رکھا ہے، اِن بندروں نے یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم اُن کے باوا کے نوکر ہیں۔''(ص ۸۷)

اُردو افسانہ نگاری کے قد آور قلم کاروں میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی بہت اہم ہے، قاسمی نہ صرف ترقی پسند تحریک کے نمائندہ ادیب ونقیب ہیں بلکہ وہ اِس تحریک کی متحد الفکر ونظر سے بھی متاثر تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور تحریک سے متاثر ہوکر جو اکتسابی ادب تخلیق اور اپنے فن میں جو بلند آہنگ پیدا کیا، اُس کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں، خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں کی رومانی فضا کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کی تحریکوں بالخصوص آزادی کی جدوجہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کا افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد دوسری جنگ عظیم کے حالات کو کوائف کے پس منظر میں تخلیق کیا ہوا ہے ''(ص ۸٦)

اِس سیاق میں پروفیسر صدیقی نے معین عقیل کے خیالات بھی نقل کیے ہیں جس میں وہ احمد ندیم قاسمی کے تخلیقی ارتفاع اور خیال کی بلندی پر لکھتے ہیں کہ ''احمد ندیم قاسمی نے اپن افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے، وہ بڑا وسیع ہے، اِس میں زندگی کچھ محدود نہیں، اس کی معاشرتی، اخلاقی اور معاشی زندگی پر ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست اور معاشیات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ انہیں نجر دحالت میں دیکھنا ممکن نہیں۔''

اِبراہیم جلیس بحیثیت افسانہ طراز ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر ملکی انتشار، افراتفری بے روزگاری، بھوک مری اور مذہبی جنونیت کے خلاف نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے غیر ملکی جبر واستبدادیت کو ختم کو کرنے کے لیے اپنے افسانوں کو ذریعہ اظہار بنایا۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> ابراہیم جلیس نے بھی سیاسی حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے انھوں ن اپنے افسانوں کے ذریعے غیر ملکی ناجائز سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کا نعرہ لگایا اور ملک میں پھیلی ہوئی معاشی بدحالی کا ذمہ دار بھی انگریز کو قرار دیا، جلیس کے یہاں اس طرح کے افسانوں میں ''چالیس کروڑ بھکاری رذیل ،زرد چہرے، تکونا دیش، ہندوستان چھوڑو، اونچی ایڑی کی گرگابی، ہمیں امن نہیں چاہیئے، بنارس کی ساڑی، عریاں، تیری اور میری آنے والی نسل'' ایسے متعدد افسانے ہیں جن میں انگریز عملداری کے ظلم و استبدا، فرقہ واریت، کسانوں کے استحصال کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور جو اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔'' (ص ۸۷)

بحیثیت مجموعی پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس باب کی تصنیف میں تحقیقی انتقاد ،ژرف بینی اور محنت شاقہ سے کام لیا ہے جو نہایت قابل تحسین ہے اور طلبہ کی نصابی ضروریات اور تسہیل میں نفع بخش ہے بلکہ باذوق قاری کے لیے بھی دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

❁❁

باب پنجم: تحریک آزادی اور اُردو ڈرامہ

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کتاب کا پانچواں باب ''تحریک آزادی اور اُردو ڈرامہ'' کے عنوان سے قائم کیا ہے جس میں محض وہی ڈرامے زیر بحث آئے ہیں جو صریح سیاسی ہیں اور جن میں بہر طور تحریک آزادی سے متعلق حالات واقعات کا تذکرہ بر سبیل تخلیقی عمل ہوا ہے یا اُس سے وابستگی اور اُسے فروغ دینے کی کوششیں بین المتون (Inter Text) موجود ہیں۔

دیگر اصناف ادب کی طرح ڈرامہ کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے اور اس کی تعریف سب سے پہلے یونان کے ممتاز فلسفی اور ناقد ارسطو نے اپنی تصنیف ''بوطیقا'' (Butiqa) میں ڈرامہ کو انسانی اعمال کی نقل قرار دیا ہے۔ یہ نقالی دراصل اپنے مخصوص معنی میں زندگی کی عکاسی کا نام ہے، ڈرامہ خود زندگی نہیں ہے البتہ انسانی زندگی کو پیش کرنے کا وسیلہ ہے۔ ملکی وقومی مسائل اور سماجی کشمکش کے تناظر میں پروفیسر صدیقی نے اپنا تحقیقی نقطۂ نظر اس طرح تحریر کیا ہے:

> ڈرامے کی ترویج وترقی کے سلسلے میں پارسیوں کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے لیکن اُن کا مقصد خالص تجارتی تھا، اس لیے ابتدائی ڈراموں میں ملکی وقومی مسائل سے بحث اور سماجی کشمکش نظر نہیں آتی البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تخلیق کیے ہوئے ڈراموں میں ملکی اور قومی جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ڈرامہ کا اسٹیج سے گہرا تعلق ہے، اِس لیے ڈرامہ اور اسٹیج ایک دوسرے کے لیے لازم

وملزوم ہیں کیونکہ اسٹیج کے بغیر ڈرامہ کا تصور ممکن نہیں۔موجودہ
دور میں ڈرامے اسٹیج کرنیکا رواج کم ہوتا جارہا ہے،اِس لیے
ڈرامے بھی کم تخلیق کیے جارہے ہیں۔''(ص۸۹)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں پارسی اردو تھیٹر کا آغاز ہوا،اِس تھیٹر کے ڈراموں میں ظرافت اور رقص وسرور کے عناصر کا زور تھا۔عوامی جذبات کی تسکین پیش نظر ہونے کی وجہ سے یہ ڈرامے فحش اور سطحی جذباتیت کے حامل تھے۔اُردو ڈرامے کو عظمت ووقار اُس وقت حاصل ہوا کہ جب اسے طالب بنارسی،احسن لکھنوی بے تاب بریلوی،رونق بنارسی،حافظ عبداللہ وغیرہ جیسے باشعور ڈرامہ نگاروں کی خدمات حاصل ہوئیں۔

اِس باب کا بنیادی موضوع بھی اُس دور میں تخلیق ہوئے ڈراموں میں سیاسی مسائل اور ملک میں قومی شعور کی بیداری میں تسعیر تلاش کرنا مقصود ہے۔اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

موضوع زیر بحث کے تعلق سے انہیں نمائندہ ڈراموں کا ذکر کیا
گیا ہے جن میں قومی اور سیاسی شعور زیر بحث رہے،اِس طرح
کے ڈراموں میں اُس دور کے سیاسی حالات سے بحث اور
ملک میں قومی شعور کی بیداری کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا
ہے۔۱۸۵۷ء کے بعد جن ڈرامہ نگاروں نے خاص طور پر
مقبولیت اور شہرت حاصل کی اُن میں آرام،رونق بنارسی،حافظ
عبداللہ،حسینی میاں،طالب بنارسی اور احسن لکھنوی کے نام
امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔''(ص۹۰)

پروفیسر صدیقی نے اپنے خیالات کے ذیل میں''اردو ڈرامہ کی تاریخ وتنقید''سے ایک اقتباس نقل کیا ہے،جس میں عشرت رحمانی لکھتے ہیں کہ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں طویل سیاسی جدوجہد کے دوران کئی ڈرامہ نگاروں نے

سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے تخلیق کیے، یہ ڈرامے عصری سیاسی تقاضوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے تھے۔ان میں سیاسی جذبات واحساس اور شعور عام نظر آتا ہے ۔اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اور قومی بیداری کے مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔''

علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے معین عقیل اور عبدالعلیم نامی کے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں جن کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے بعض ڈراموں میں صرف سیاسی واقعات وحالات پیش کیے گئے، یا کھل کر برطانوی مظالم، سیاسی جبر واستحصال اور اُن کی مفسدہ پردازیوں کو اسٹیج کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ چند ایسے ڈراموں کا بھی ذکر ملتا ہے جن میں آزادی کی اہمیت، حصول آزادی کی ترغیب اور برطانوی حکومت سے نجات جیسے موضوعات کو برتا گیا ہے اور عبدالعلیم نامی کے مطابق کہ ۱۸۹۳ء میں امراؤ علی لکھنوی نے ''البرٹ بل'' کے نام سے ایک ڈرامہ تخلیق کیا تھا جس میں ابتدا سے کلائمکس تک انگریزوں کے مظالم، ظلم وستم اور جبر واستبداد کے مناظر پیش ہوئے تھے اور انگریزوں نے مقامیوں کو کس کس طرح اپنی فریب کاریوں سے غلام بنائے رکھا نیز مذکورہ ڈرامے میں انگریزوں کو حد درجہ متکبر، متعصب اور ظالم دکھایا گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندو اور مسلمانوں نے ساتھ مل کر لڑی تھی، اس جنگ کے ہارنے کے بعد ہندوستان بالخصوص اودھ کی سماجی زندگی میں کچھ تغیرات پیدا ہوئے اور اُردو ادب خاص طور پر ڈرامہ بھی انہیں عوامل کو اپنے اندر سمیٹے ایسے کرداروں کو پیش کرنے لگا تھا۔

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ایسے کئی مشہور ڈراموں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں جن میں ملک وقوم کی محبت اور خدمت کا جذبہ اور اشتیاق پایا جاتا ہے:

> متعدد ایسے ڈرامے تخلیق کیے گئے جن میں حب الوطنی اور ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے ۔مثلاً اصغر نظامی کے ڈرامے ''قومی دلیر'' سے ہندو مسلم اتحاد و یگانگت جھلکتی ہے ۔عبداللطیف نے ''ہمارا گھر'' تصنیف کیا، اِس ڈرامے کا مرکزی کردار ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں سے بے پایاں

محبت کرتا ہے اور قومی یکجہتی و یگانگت یقین رکھتا ہے، وہ اپنا تمام سرمایہ اور خلافت فنڈ کو دے دیتا ہے۔اسی طرح عباس علی نے ''لیڈی جونتی'' اور ''شاہی فرمان عرف دیش اپدیش'' تخلیق کیے۔آخرالذکر ڈرامے کا مرکزی کردار رام ناتھ اخبار ''ہندو درپن'' کا ایڈیٹر ہے، رام ناتھ انگریزوں کی بدعنوانیوں اور حکمت عملی کی خامیوں پر تنقید کرتا ہے۔محشر انبالوی کا ڈرامہ ''غریب ہندوستانی عرف انقلاب'' یعنی سودیشی تحریک ہے انھوں نے اِس ڈرامے میں مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے کردار ہری پانڈے اور شیو پانڈے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

(ص۹۲)

اِسی سیاق میں دل لکھنوی، شمس لکھنوی، محی الدین اور اظہر دہلوی وغیرہ کے ڈراموں کا تجزیہ اور معنوی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

دل لکھنوی کا ڈرامہ ''تاج محل'' ہندو مسلم یگانگت اور یک جہتی پر مبنی ہے۔ایک دوسرے ڈرامے ''وطن'' میں ہندوستانیوں کی جدوجہد کو پیش کیا ہے۔شمس لکھنوی کے ڈرامے ''مادر وطن'' اور ''حب الوطن'' خاص ہیں، انھوں نے ان ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات کو نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ وطن کی محبت ہر ہندوستانیوں کا فرض ہے اور غلامی سے نجات کے لیے ہندوستان کے ہر فرد کو جدوجہد کرنی چاہیے۔محی الدین عزم کا ڈراما ''دیش کی پکار'' ایک اہم ڈرامہ ہے اِس ڈرامے کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے

کی کوشش کی ہے۔ ’’گوشئہ افلاس عرف خون حسرت‘‘ کے عنوان سے وحشت دہلوی نے ایک ڈرامہ تصنیف کیا تھا، اِس میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی ہے، وحشت دہلوی نے اس ڈرامے میں سرمایہ داروں کے مظالم اور عوام کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔ ’’بیداری‘‘ اظہر دہلوی کا اہم ڈرامہ ہے اس ڈرامے میں آزادی کی تحریک کا پورا سیاسی تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً تحریک عدم تعاون کی حمایت ،تحریک خلافت جلیانوالہ باغ کا سانحہ ،مارشل لا،سودیشی تحریک کے مختلف واقعات اور ان کے عواقب بیان کیے گئے ہیں اور ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے اور قربانیاں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔‘‘ (ص۹۳)

پروفیسر صدیقی نے اظہر دہلوی کے ڈرامہ ’’بیدار‘‘ سے ایک اہم منظر نقل کیا ہے جس میں مختلف کرداروں کے درمیان مکالموں میں سانحہ جلیانوالہ باغ کا بدلہ، عدم تعاون اور تحریک خلافت اور سوراج حاصل کرنے کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اِسی تناظر میں پروفیسر صدیقی سردار جعفری کے ڈرامہ ’’یہ کس کا خون ہے‘‘ سے ہندوستانیوں کی شجاعت و بہادری کے قصے اور قومی جذبہ کی تفہیم میں لکھتے ہیں:

سردار جعفری کا ڈرامہ ’’یہ کس کا خون ہے‘‘ پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے اِس ڈرامے میں ہندوستانیوں کی جدوجہد، شجاعت اور بہادری کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بھیم اور ارجن، اکبر اور ٹیپو جھانسی کی رانی اور بھگت سنگھ کی روح ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ڈراموں کی ایک مجموعہ ’’نئی تصویریں‘‘ سجاد ظہیر نے مرتب کیا تھا۔ اِن ڈراموں میں ’’ہیلڈ رک‘‘ ہے جس میں

دوسری جنگ عظیم کے واقعات ،ہندوستان کے حوالے سے
بیان کیے گئے ہیں ۔دوسرا ڈرامہ ''مارشل تمونکو'' ہے اور تیسرا
ڈرامہ ''لال جھنڈا'' ہے۔'' (ص۹۲ تا ۹۳)

اردو ڈرامہ کی تاریخ میں ایسے ڈراموں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں سیاسی رہنماؤں اور قومی ہیرو کو خیال میں رکھ کر بہترین ڈرامے تخلیق کیے گئے ہیں۔اس حوالے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

لالہ کشن چندر زیبا کا ڈرامہ ''شہید وطن'' موتی لال نہرو کی
زندگی پر محیط ہے۔اس میں دکھایا گیا ہے کہ موتی لال نہرو اپنے
پورے خاندان کے ساتھ اپنی زندگی قوم کی خدمت میں صرف
کر دیتے ہیں اور گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں
حصہ لیتے ہیں ۔نور الٰہی محمد عمر کا ڈرامہ ''روح سیاست'' پنڈت
نہرو اور ابراہم لنکن کی سیاسی جدوجہد پر مشتمل ہے اور اِس میں
دونوں کی ملکی ،سیاسی اور ملّی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔اشتیاق
حسین قریشی کا ڈرامہ ''نقش آخر'' جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے
واقعات پر مبنی ہے۔مسلمانوں کی تباہی اور بربادی خصوصاً مغلیہ
سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو تاخت و تاراج
ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے نیز مسلمانوں میں قومی سیاسی اور
تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔(ص۹۴ تا ۹۵)

پروفیسر محمد مجیب کے مقصدی اور اصلاحی ڈراموں کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی نے ان کا مشہور ڈرامہ ''آزمائش'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

پروفیسر محمد مجیب نے بھی بعض اہم ڈرامے تخلیق کیے ،انھوں
نے مقصدی اور اصلاحی ڈراموں کے علاوہ تاریخی ڈرامے بھی
لکھے ہیں پروفیسر مجیب کے ڈراموں میں آزمائش'' قابل ذکر

ہیں۔ مجیب صاحب کا ڈرامہ آزادئ ہند کے بعد یعنی جولائی ۱۹۵۷ء مین پہلی بار منظر عام آیا اصلاً یہ ڈرامہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اِس ڈرامے کو پڑھنے کے بعد ہندوستان کی جنگ آزادی اور حریت پسندوں کے عزم و حوصلے کا پتہ چلتا ہے۔''(ص۹۵)

پروفیسر صدیقی نے محمد مجیب کا ڈرامہ ''آزمائش'' کے حوالے سے قمر اعظم کی تصنیف ''اردو ڈرامہ'' سے ایک اہم اقتباس نقل کیا گیا ہے جس میں وہ ''آزمائش'' کی معنوی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اِس میں انگریزوں کے خلاف عوام اور فوجیوں کی بغاوت اور شہزادہ مرزا مغل کی رہبری نے وطن پرستانہ سرفروشی اور سرفروشانہ وطن پرستی کے سلسلے میں قومی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی پوری وضاحت کردی ہے۔ یہاں عقائد و عزائم ،شدت وقوت کے ساتھ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں ،ان سے اثر انگیز مکالموں کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور منزل و مقصد کے راستے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اِن ڈرامائی واقعوں اور مکالموں میں ڈرامانگاری کی صرف معلومات ہی نہیں محسوسات بھی ہیں۔''

بقول پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کہ مذکورہ بالا ڈراموں میں سیاسی ،سماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ ،عصری تقاضوں کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ یہ ڈرامے اُس دور کے قومی اور سیاسی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔

❁❁

باب ششم: تحریک آزادی اور اُردو طنز و مزاح

اُردو کے نثری ادب میں طنز و مزاح کا سرمایہ مختصر ہونے کے باوجود قدر اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔طنز و مزاح کے جتنے روپ ممکن ہیں ،وہ سب،خواہ وہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں ،اردو نثر میں ضرور مل جاتے ہیں۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مذکورہ تصنیف کا باب ششم تحریک آزادی اور اُردو طنز و مزاح کے تعلق سے تحریک آزادی کے تناظرات میں تخلیقی محرکات کا جائزہ پیش کرتا ہے۔پروفیسر صدیقی نے طنز و مزاح کے پس منظر میں منشی سجاد حسین کے مضامین اور سیاسی نظریات سے بحث کرتے ہوئے''اودھ پنچ'' کے قلم کاروں کی تخلیقات اور دیگر تحریروں کا بھی جائزہ لیا ہے۔اِس ضمن میں بعض ایسے مضامین زیر بحث آئے ہیں جن میں دل بستگی کے پیرائے میں حکومت وقت کو تیر بہدف بنایا گیا ہے نیز سجاد حسین کے طنزیہ و مزاحیہ مکتوبات بھی موضوع بحث بنے ہیں جو انھوں نے اُس دور کے سیاسی تناظر میں حکام کو تحریر کیے تھے۔اُردو طنز و مزاح اور ۱۸۵۷ء کے بعد کے پس منظر میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> اُردو نثر میں طنز و مزاح کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا،اس سلسلے میں غالبؔ کے خطوط خاص طور پر توجہ طلب ہیں ،غالب کے خطوط ہی نے اردو نثر میں طنز و مزاح کی خشت اوّل رکھی خطوط غالبؔ کے بعد''اودھ پنچ'' کے طنز و مزاح نگاروں نے اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔اودھ پنچ کے قلم

کاروں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی اور مختلف اسالیب کے ذریعے اس فن کو ارتقائی منزلوں تک پہنچایا۔اودھ پنچ سے قبل ،ہجویات،شہر آشوب اور نظموں کی صورت میں طنز ومزاح کے نمونے ملتے ہیں اودھ پنچ کا اِجراء۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں ہوا،اس اخبار کے منشی مدیر سجاد حسین تھے جنھوں نے طنز ومزاح کے لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار کیا تھا اس کے قلم کاروں نے زندگی کے ہر شعبے اور ہر جہت مثلاً سیاسی سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی مسائل اور معاملات کی اپنی توجہ کا مرکز بنایا،اُس دور کے حکمراں طبقے اور انگریزوں کی عملداری کو ہدف طنز بنایا۔''(ص۹۸)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں انگریزوں کی نقالی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔مرد وزن کا انداز گفتگو، وضع قطع اور لباس میں جدت آنے لگی، زبان میں بھی انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے اور ادب میں کئی مغربی اصناف کا بھی ظہور ہوا ایسے وقت میں ''اودھ پنچ'' نے طنز و مزاح کے ذریعے ہندوستانیوں کی ہر نقالی اور بے ڈھنگی چال پر تیر چلائے اور انگریزوں کی حمایت میں بولنے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔

اِس سلسلے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ۱۹۵۹ء کے رسالہ ''نقوش'' (لاہور) شمارہ جنوری رفروری (طنز ومزاح نمبر) سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ ''غدر کے بارہ سال بعد غالبؔ کے خطوط اور نذیر احمد کی مراۃ العروس شائع ہونے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۷۷ء میں ''اودھ پنچ'' جاری ہوا،''اودھ پنچ'' مشرق اور مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔''

اِس ضمن میں رشید احمد صدیقی کے ضیاء افروز خیالات بھی بہت اہم ہیں جنہیں پروفیسر

صدیقی نے بڑے اہتمام کے ساتھ مقالے کا حصہ بنایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''اودھ پنچ'' نے اپنی پالیسی کے ذریعے ملک وقوم کی خدمات ایسے وقت انجام دیں، جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ آسمان سیاست پر بے چینی اور انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔''

پروفیسر صدیقی نے ''اردو ادب میں طنز ومزاح'' سے ایک اور اقتباس نقل کیا ہے جس میں وزیر آغا نے ''اودھ پنچ'' کے عصری سیاسی مسائل کے تمام تناظرات سامنے آجاتے ہیں، وزیر آغا لکھتے ہیں کہ ''اودھ پنچ'' اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردِّعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔ سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا، انتہائی پستی اپنے جوبن پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر شخص اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا، ایسے میں ''اودھ پنچ'' نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے، جب اسے آئینے میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرہ مضحکہ خیز حرکات کرتا نظر آیا تو فرد کو ندامت بھی محسوس ہوئی اور اس کے جوش وانہماک میں اعتدال پیدا ہو گیا۔''

''اودھ پنچ'' کا سب سے اہم ہدف اور مستقل موضوع اُس دور کی سیاست تھا۔ سجاد حسین نے سیاست کے داؤ پیچ سے عوام الناس کو آگاہ کیا بلکہ انھوں نے ضرر رساں سیاست دانوں اور انگریز حکومت کی ذہنیت کا پردہ چاک کرتے ہوئے، اُن کے طرزِ عمل پر کاری ضربیں بھی لگائیں۔ اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے سجاد حسین کی تخلیقی کاوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سجاد حسین نے متعدد سیاسی اور سماجی مضامین سپرد قلم کیے نیز اُن مضامین میں سیاسی مسائل سے بحث کی، انھوں نے طنز ومزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں

کا پردہ ایسے فاش ایسے دور میں فاش کیا جبکہ سیاسی رہنماؤں کے لیے لب کشائی بھی مشکل تھی۔انھوں نے انگریزوں کی عملداری کی اُن پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔یہ مضامین طنز ومزاح کے پردے میں پیش کیے گئے تھے ،اس لیے قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور استہزاء کا پہلو بھی برقرار رہا،ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز ومزاح کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔منشی سجاد حسین کا مضمون ''انڈے بچّے والی چیل چاہاڑ'' اُس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جارہے تھے اور کانگریس کی مخالفت میں ''انٹی کانگریس'' کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔''(ص۱۰۱)

پروفیسر صدیقی نے اپنے مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں منشی سجاد حسین کی ایک طنزیہ تحریر کا اقتباس نقل کیا ہے ،جس میں سجاد حسین ''اینٹی کانگریس'' کی مخالفت میں ''اُس کا ''بی کانگریس'' اور بی اینٹی صاحبہ'' جیسے الفاظ میں تمسخر اڑایا ہے۔

ہفت روزہ ''اودھ پنچ'' اخبار کی کامیابی ،منشی سجاد حسین کی رہین منت ہے،اُن کا اپنا قلم بھی اپنے مقاصد میں مؤثر ثابت ہوا، جہاں اُن کی تصانیف ''بغلول،طرحدار لونڈی'' اور ''احمق'' آج بھی مقبول ہیں، وہیں اُن کے طنزیہ انداز میں لکھے مکتوبات کی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے، جوانھوں نے رائسوں، سیاست دانوں اور سرکاری اعلیٰ افسروں کے نام لکھے تھے۔منشی سجاد حسین کے مکتوبات کے ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

سجاد حسین طنز ومزاح کے پیرائے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھرپور انداز میں کردیتے ہیں سجاد حسین کے خطوط بھی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل

ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے بحیثیت مدیر ''اودھ پنچ'' مختلف اوقات میں مختلف افسران بالا کو تحریر کیے تھے۔ منشی سجاد حسین اپنے خطوط میں طنز کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں جو یقیناً طنز سے خالی نہیں ہوتا، انھوں نے جو خطوط انگریز افسروں کو لکھے ہیں، ان میں بھی تیر ونشتر سے کام لیکر اپنی بات کہی ہے (ص ۱۰۱ تا ۱۰۲)

منشی سجاد حسین کے متعدد مکتوبات ملتے ہیں جن میں طنز ومزاح کے پیرائے میں حکام بالا کو خواب غفلت سے بیدار کیا ہے یا پھر ان کے دانستہ طور پر اپنائے گئے بے جا رویے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مندرجہ بالا فکر وخیال کے ذیل میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے منشی سجاد حسین کے مکتوبات سے اقتباس بھی پیش کیے ہیں، جنہیں ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

اقتباس (۱)

''صاحب من! جب کسی کی کاروائی کا مصمم ارادہ کر لیا جائے اور کچھ لحاظ نہ رہے کہ ملک کے مناسب حال ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ موقع افہام وتفہیم، گنجائش، پند وواعظ اس طرح غائب ہے جیسے برہمایا ہندوستان مگر دنیا کا کوئی حل بے نتیجے رہ نہیں سکتا رہ، آج نہیں کل، یہاں نہیں وہاں ضرور بالضرور کچھ نا کچھ اثر ضرور کرتا۔''

اقتباس (۲)

'' لارڈ رنڈالف چرچل جو بدقسمتیٔ ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کمسنی اور درشت گوئی اور بدزبانی مانع ترقی ہے معاملات ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی یہ یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگی قوم کی دست برد سے اعزاز قیصری سے

محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے۔'' (ص۱۰۱تا۱۰۲)

اِس ضمن میں پنڈت جوالا پرشاد برقؔ کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کو ذریعہ اظہار بنایا، اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> اسی سلسلے کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد طرقؔ ہیں انھوں نے طنز و مزاح اور تحریف کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ رشید احمد صدیقی نے جوالا پرشاد برقؔ کو اردو ادب کا ہولیس اور چاسر کہا ہے۔ پنڈت جوالا پرشاد برقؔ کے بیشتر تراجم ملتے ہیں انھوں نے چند ایسے مضامین بھی لکھے جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث مل جاتی ہے'' (ص۱۰۲)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے پنڈت جوالا پرشاد برقؔ کے مضمون ''البرٹ بل'' سے جزوی حصہ نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اختیار ملا مگر برائے نام، مگر ہمت نہ ہارنا چاہیئے پارلیمنٹ میں واویلا ضرور رہو، ہندو دشمنوں سے سبق لو، کچھ کھو چکے، اب تو سیکھو، دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، اگر تم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھدوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا مگر ہمارا شیوہ نہیں، ہم تو سچّے خیر خواہِ سرکار ہیں، مگر ہائے رہے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں ڈوب گئی، کیا کیا خیالی قلعے بنائے گئے مگر کنسکاڈت کے ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی طنز و مزاح نگاروں کے تذکرے میں ایک نام نواب سید محمود آزاد کا بھی سامنے لائے ہیں جنھوں نے اپنے تلخ تجربات و مشاہدات کو شوخی اور ظرافت انگیز پیرائے میں پیش کیا ہے۔ بقول پروفیسر صدیقی:

> طنز و مزاح نگاروں میں نواب سید محمود آزادؔ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے تلخ تجربات کو شوخی و ظرافت کے پیرائے

میں پیش کرتے ہیں، انھوں نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب
اور ثقافت کا مضحکہ اُڑایا ہے۔انھوں نے تحریفات کے انداز
میں ایک ''ڈکشنری'' بھی تحریر کی تھی جس میں انھوں نے
ظریفانہ پیرائے میں بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں۔''
(ص۱۰۳)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اسی سیاق میں سید محمود آزاد کی ڈکشنری سے چند اقتباس نقل کیے ہیں جن میں کسی ایک لفظ کے معنی ظریفانہ اور استہزائیہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں مثلاً ''پارلیمنٹ'' (جلسہ مدبران ملکی) مدبروں کا آشیانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کا تماشہ دکھانے کا تھیٹر یا باہمی نفاق اور ذاتی رشک وحسد کا تنور، انصاف آموزی کا وہ اسکول جہاں روسیو کے ظلم ناحق کے انسداد کی کوئی عمدہ سبیل نہیں۔

اخبار ''اودھ پنچ'' طنز و مزاح کی سمت اکیلا گامزن نہیں تھا بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ رسائل واخبارات کا ایک ہجوم محوِسفر تھا جن میں ''الپنچ'' بھی شامل ہے، اور ایک عام خیال کی رو سے بہار کی اُردو صحافت ''الپنچ'' کے ساتھ ہی بیسویں صدی میں داخل ہوتی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اخبار ''الپنچ'' کے متعلق لکھتے ہیں:

اُس دور کے اخبارات میں ''الپنچ'' بھی قابل ذکر ہے، یہ اخبار
پٹنہ سے جاری ہوا تھا، اِس اخبار نے اُس دور کے عصری سیاسی
اور سماجی مسائل اور ہنگاموں سے بحث کی ہے۔''الپنچ'' میں
سوال از آسمان و جواب از سیمان' کے عنوان کے تحت
انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کا احساس اور ہندوستانیوں
کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کا ہے'' (ص۱۰۴)

اخبار ''الپنچ'' کے حوالے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت شائع ہونے والے کالم چند کے اقتباسات نقل کیے ہیں جن میں انگریز حکام کے سفاکانہ

اور جابرانہ رویوں کا پتا چلتا ہے مثلاً:

(سوال) ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں اور انگریزوں میں کتنی دفعہ اور کون کون وقت کھاتے ہیں؟۔

(جواب) امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بیماروں کو میسر ہی نہیں اور غریب بیچارے کبھی دو دن اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے، انگریز دن میں پانچ مرتبہ۔

سوال: خون کے مجرم کو قانون کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی۔؟

جواب: ہندوستانی کو سزا دینے کے لیے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں، جب چاہے قید کیجیے اور جب چاہے پھانسی دیجیے مگر کوئی انگلش نژاد وفادار رعیب دس ہندوستانی بھی مار ڈالے تو کچھ پروا نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے فکاہیہ کالم نویسی کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے بلکہ اردو صحافت میں کالم نویسی کی ابتدا ہی مولانا آزادؔ کے کالموں سے ہوتی ہے۔ اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> طنز و مزاح کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزادؔ کا نام بھی بری اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، سیاست دان ،اعلیٰ پائے کے صحافی اور طنز و مزاح نگار تھے۔ طنز و مزاح کے ضمن میں ''الہلال'' کا شذرہ ''افکار و حوادث'' قابل ذکر ہے اِس میں مولانا کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں ہوتی تھں جن میں کہیں کہیں انگریزوں کو ہدف طنز بنایا گیا ہے۔'' (ص ۱۰۶)

مولانا محمد علی جوہرؔ کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت ادراک کا ہر کوئی معترف ہے۔ وہ بیک وقت پائے کے انشا پرداز، ادیب، نامور صحافی، شعلہ بار خطیب اور جنگ آزادی کے سالار قافلہ تھے۔ اُن کی ہمہ گیر شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

مولانا محمد علی جوہؔر کا نام ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے، وہ محبّ وطن تھے، انھوں نے لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں انگریزوں سے کہا تھا ''میں یہاں سے آزادی کا وثیقہ لیکر جاؤں گا یا پھر یہیں پر اپنی جان دے دوں گا'' بالآخر مولانا محمد علی جوہؔر کی وفات لندن میں ہوئی اور انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان قربان کردی۔ مولانا محمد علی جوہؔر نے اسی مقصد کے تحت اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا، یہ ایک اہم سیاسی اخبار تھا ''ہمدرد'' میں انھوں نے متعدد سیاسی مضامین لکھے اور ایسے وقت میں قلم اٹھایا جب ملک میں بہت سے سیاسی مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ سیاسی طور پر ہندوستان کے حالات منتشر تھے۔ مولانا محمد علی جوہؔر نے اپنے قلم اور خیالات کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت انجام دی ،ان کا ایک مضمون ''سائمن کمیشن'' اور ہندوستان کے عنوان سے ''ہمدرد'' کے ۲۹/جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔'' (ص ۱۰۶)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی محولہ بالا خیالات کی روشنی میں ابواللیث صدیق کی ''آج کا اردو ادب سے مولانا محمد علی جوہؔر کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کیا ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی سائمن کمیشن کی آمد کی شدید لہجے میں مخالفت کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر کمیشن کا ہر رکن ہندوستانی ہوتا تب بھی ہمیں کمیشن ہرگز قبول نہ ہوتا ،اس لیے کہ اگر چہ خوش دامن صاحبہ تشریف نہ رکھتیں تاہم آخر فیصلہ میاں بیوی کے ہاتھ میں نہ ہوتا بلکہ ہندو مسلمان دونوں بیویاں بن جاتے اور سوکنوں اور بیرنوں کی طرح لڑتے اور فیصلہ میاں کرتے اگر ہم دونوں اتحاد و اتفاق کر لیتے تب بھی جب تک فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ ہوتا، وہی عربوں کی مثل صادق آتی

ہے کہ ''ہر کام میں گھر والی سے مشورہ ضرور کر لیا کرو مگر کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو۔''

اُردو طنز و مزاح میں ایک اہم نام ملاّ رموزی کا بھی ہے۔ ملاّ رموزی اپنی گلابی اردو کے لیے خاصا مقبول ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ گلابی اُردو اور ملاّ رموزی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ایک عام خیال کے مطابق، اُن کے کالم شائع ہوتے ہی حکومت پریشان ہو جاتی تھی۔ مغربی ضرر رساں تہذیب اور ثقافت نے ہندوستانی قوم کی اخلاقی اقدار پر جو بالواسطہ ضرب لگائی تھی، ملاّ رموزی نے طنز و مزاح کے انداز میں اُن کا منہ توڑ جواب دیا۔

ملاّ رموزی کی ادبی خدمات، اسلوب اور اُن کے موضوعات سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> اُس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں ملاّ رموزی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ملاّ رموزی کی نثر بڑی متنوع ہے، انھوں نے سیاست مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرہ اور ادب و قومیت کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ ان کے طنز و مزاح کا بیشتر حصہ سیاست پر مشتمل ہے۔ ان کے مضامین میں سیاسی واقعات اور سانحات کی طرف اشارے جگہ جگہ مل جاتے ہیں
> (ص ۱۰۷)

اس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے ملاّ رموزی کے مضمون سے ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اے انگریزی تیل سر میں ڈالنے والوں! خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمہارے ان ایڈیٹروں اخبار اردو کے کہ یہیں جواب دیتے ہیں، وہ مبلغ ایک برس تک نامہ نگاروں اور خریداروں اپنے کو ساتھ بہانہ مصروفیتوں اپنی کے، اور لائڈ جارج وفد مسٹر محمد علی کو ساتھ تعصب اور گھمنڈ قوت حکومت اپنی کے اگر چہ دم بیچ ناک کے کر دیا، جماعت سن فیل نے فوجوں برطانیہ کا وغیرہ وغیرہ۔''

اردو طنز و مزاح کا عبوری دور ختم ہونے کے بعد طنز و مزاح نگاروں کی بڑی دلچسپ

فہرست سامنے آتی ہے ، مثلاً رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، حاجی لق لق، شوکت تھانوی کرشن چندر، کنہیا لال کپور وغیرہ لیکن اِس فہرست میں موضوع کی مناسبت ،عصری میلانات اور ارتکاز کے حوالے سے عظمت اللہ خاں کا نام بہت خاص ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> اِس ضمن میں عظمت اللہ خاں کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔
> عظمت اللہ خاں ایک سنجیدہ طنز و مزاح نگار ہیں، وہ بڑی عمدگی اور شگفتگی سے اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں ،اُن کے مضامین بڑے دلچسپ اور سنجیدہ ہوتے ہیں جو قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں عظمت اللہ خاں کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کے مطالعہ میں ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے، اُن کے اِس طرح کے مضامین میں ''گڑیا خانہ، ڈیڑھ اینٹ'' خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ اِن مضامین میں اُس دور کے سیاسی مسائل پر خاطر خواہ بحث مل جاتی ہے۔''(ص۱۰۸)

اِس سلسلے میں پروفیسر صدیقی نے عظمت اللہ خاں کے مضمون ''ڈیڑھ اینٹ'' سے بہت اہم اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''غرض ہندوستانی افواج کا احسان کہ برطانیہ کو ہندوستان پر مسلط کر دیا، امن کا دور دورہ ہوا، لارڈ میکالے کا کرم کہ ایک طرف تعزیرات ہند مرتب کیا اور دوسری طرف علم مغرب کی گنگا بہائی۔''

مضمون ''گڑیا خانہ'' میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اب وہی ہندوستان ہے جہاں مادر وطن اور سوراج کی خاطر مہاتما اور مولانا جیل جانا فخر سمجھتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے ہے؟ برطانوی شہنشاہیت اور دفتر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے۔''

میاں عبدالعزیز فلک پیما کا نام بھی بحثیت طنز و مزاح نگار بڑی اہمیت کا حامل

ہے۔ پروفیسر صدیقی نے فلک پیما کی زبان دانی اور دل نشیں لہجے پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے تحریری نمونے بھی پیش کیے ہیں:

> میاں عبدالعزیز فلک پیما کا نام طنز ومزاح کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، ان کی نثر شگفتہ، لہجہ دلنشیں متین اور سنجیدہ ہے۔ فلک پیما کے مضامین میں عصری سیاسی مسائل اور عوام کی جدوجہد آزادی سے بحث ملتی ہے۔ اُن کے اِس قسم کے مضامین میں ''شملے کی سڑکیں عداوتیں'' اور شیطان بزرگ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔'' (ص۱۰۹)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے میاں عبدالعزیز فلک پیما کے مضمون ''شملے کی سڑکیں، شیطان اور بزرگ'' اور ''عداوتیں'' سے اہم اور دلچسپ اقتباسات نقل کیے ہیں جن سے عصری سیاسی مسائل کی معنوی قربت کا سراغ لگانا آسان ہوجاتا ہے۔ میاں عبدالعزیز فلک پیما مختلف کرداروں کے مابین مکالموں کے ذریعے نہایت سلیقے اور طنز کے پیرائے میں اپنی بات کہنے میں مہارت رکھتے تھے۔

چراغ حسن حسرتؔ اُردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی تھے، جنھوں نے یوں تو تمام اصناف ادب میں طبع آزمائی کی اور اردو ادب میں نام ومقام حاصل کیا لیکن طنز ومزاح نگاری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا، ان کا شمار صف اوّل کے طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اُن کے فکاہیہ کالموں اور اُس دور کی سیاسی صورت حال ہنگاموں اور واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اردو طنز ومزاح میں چراغ حسن حسرتؔ کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے حسرتؔ جنگ آزادی کے عظیم مجاہد تھے انھوں نے بیشتر فکاہیہ کالم لکھے، اُس دور کی سیاسی صورت حال ہنگامی واقعات اور دیگر مسائل سے بحث کی، پنجاب کی چند سیاسی

شخصیتوں کو طنز کا نشانہ بنایا اور چند انگریز پرست سیاست دانوں کا تمسخر اُڑایا ہے۔‘‘(ص۱۱۰)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے حسرتؔ کی کتاب ’’پنجاب کا جغرافیہ‘‘ سے مختلف عنوان کے تحت بڑے ہی دلچسپ اقتباس نقل کیے ہیں جسے من وعن تحریر کرنا بہتر ہے:

(کانگریسی ندی نالے)

’’بھار گو بربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں ،اِس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگریس ندی بہت مشہور ہے جو ست پڑا سے ایک زمانہ میں بہہ نکلی تھی ،یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا بھی پانی آتا تھا۔بہرحال یہ برساتی ندی تھی اوراب خشک پڑی ہے۔‘‘

(دریائے کالی)

ہندو مہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے ’’کالی ناگ‘‘ کہتے ہیں،یہ دریا اُسی چشمے سے نکلتا ہے اور ہندو مہاسبھا کی ترائی اور کانگریزی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہالاتا ہے۔کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندو مہاسبھا کی ترائی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ دریا کس علاقے کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے،اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دھن بدیسی ہے۔اس کا طاس جسے ٹریبیول کہتے ہیں،بہت زرخیز ہے۔‘‘(ص۱۱۰تا۱۱۱)

شوکت تھانوی کا شمار اپنے دور کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے کم وقت میں بہت زیادہ مزاحیہ مضامین لکھے،ان کے مزاحیہ مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں

نے مزاح کا رنگ پیدا کرنے کے لیے ہر زاویہ نگاہ اور ہر چو بدستی کا استعمال کیا اور سیاسی مسائل سے بھی بحث کی پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اُن کی زود گوئی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اُن کے دو مشہور مضامین ''سودیشی ریل'' اور لکھنؤ کانگریس سیشن'' سے ایسے اقتباس نقل کیے ہیں جن کی قرأت سے سیاسی تحریکوں اور عصری حالات وکوائف کی معنوی حیثیت سامنے آتی ہے۔

> جہاں تک شوکت تھانوی کی مزاح کا تعلق ہے، وہ بڑے زود نویس قسم کے مزاح نگار تھے۔ ''سودیشی ریل'' اور لکھنؤ کانگریس سیشن''اِن دونوں تحریروں میں اُنہوں نے اُس دور کی سیاسی تحریکوں کو اجاگر کیا ہے۔'' (ص ۱۱۱)

کنہیالال کپور بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ وہ نہایت سادہ اور سہل نثر لکھتے تھے لیکن بین السطور طنز کی کاری لہریں رواں ہوتی تھیں، ان کے مزاحیہ مضامین میں سماج کی ناہمواری اور بے راہ روی پر شدید طنز ملتا ہے۔ اُن کی انہیں خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> کنہیالال کپور نے معاشرے میں پھیلے ہوئے سیاسی انتشار بد عنوانیوں اور بدانتظامیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا سیاسی عمائدین اور زعما کی شخصی کمزوریوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ''آپ نے سیاست کی باقاعدہ تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی مسٹر چرچل اور جوزف اسٹالین سے کیوں افضل سمجھتے ہیں؟ آپ جیل خانہ سے کیوں ڈرتے ہیں؟۔'' ایک اور جگہ گاندھی جی کی قربانیوں سے متاثر ہوکر لکھتے ہیں۔ ''کمال کر دکھایا مہاتما جی نے، پورے تین ہفتہ کچھ نہیں کھایا، روحانی طاقت ہے، اوتار ہیں۔'' (ص ۱۱۲)

رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح کی فنی خصوصیات کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا ہے، ان کی اس قسم کی تحریروں میں فکر انگیز ظرافت سے شخصیت کی تہذیب، تضحیک، توقیر، ہمدردی اور

کہیں کہیں رقت کی آمیزش نظر آتی ہے۔ پروفیسر صدیقی ان کی فنی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> رشید احمد صدیقی کا نام اردو دنیا میں بحیثیت طنز ومزاح نگار امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے یہاں طنز وظرافت کے پس پشت چند اصلاحی مقاصد بھی نظر آتے ہیں جو تہذیبی سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑے اہم اور ضروری تصور کیے جاتے ہیں رشید احمد صدیقی غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے ذکاوت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ،وہ معمولی بات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر طنز کا پہلو مقصدیت کے تحت پیدا کر لیتے ہیں۔''(ص۱۱۳)

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے رشید احمد صدیقی کے مضامین سے کئی اہم اقتباسات نقل کیے ہیں جن کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جارہا ہے:

> ''عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے،انگریز تو ممکن ہے اِس نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیرات ہند اور میونسپلٹی دونوں اُن کی آوردہ ہیں عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے بے نیاز ہے۔''(ص۱۱۳)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مذکورہ باب کے اختتام پر طنز ومزاح کے ابتدائی دور اور اس ارتقا سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ''اردو نثر میں طنز ومزاح ،تحریف اور فکاہیہ مضامین کا جو سلسلہ غالبؔ کے خطوط سے شروع ہوا تھا''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں نے اُسے باضابطہ فن کی حیثیت دی اخبار''اپنچ'' نے اِس کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا،کنہیالال کپور اور رشید احمد صدیقی جیسے صاحب قلم فنکاروں نے اسے نقطۂ عروج تک پہنچایا،اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اُردو طنز و

مزاح نگاروں نے اپنی گرانقدر تحریروں کے ذریعہ عوام کو غلامی کا احساس دلایا اور آزادئ ہند کی تحریکوں کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔‘‘

❁❁

باب ہفتم: تحریک آزادی اور اُردو خود نوشت وسوانح

آزادی ہند کی تحریکوں سے متعلق تقریباً ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی گئی ہے اور صاحب قلم فنکاروں نے اپنے فن پاروں کے ذریعے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تصنیف ''تحریک آزادی اور اردو نثر'' کے اِس باب کو دو حصوں میں منقسم کرتے ہوئے یعنی ''خود نوشت اور سوانح عمری'' میں تحریک آزادی کا مطالعہ پیش کیا ہے پہلا حصہ خود نوشت سوانح عمریوں سے متعلق ہے جبکہ دوسرے حصے میں سوانح عمریوں کا محض ذکر ملتا ہے اور صرف انہیں سوانح عمریوں اور خود نوشت سوانح کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں بالتخصیص سیاسی رنگ اور جن میں بالواسطہ یا بلا واسطہ آزادی کی جدوجہد کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

موضوع کی مناسبت سے اِس باب میں جن خود نوشت سوانح عمریوں کو شامل کیا گیا ہے، اُن میں جعفری تھانیسری کی ''تواریخ عجیب''، ظہیر دہلوی کی ''داستان غدر''، سید رضا علی کی ''اعمال نامہ''، افضل حق چودھری کی ''میرا افسانہ''، نواب احمد سعید خاں چھتاری کی ''یادِ ایام''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، عبداللطیف بٹالوی کی ''لطیف کی کہانی'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک سوانح عمریوں کا تعلق ہے تو اُن میں بعض اہم سوانح عمریوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور بعض کی صرف نشاندہی کی گئی ہے۔

خود نوشت سوانح ایک غیر تخلیقی صنف ہے جس میں کوئی شخص اپنے حافظہ کے پنجرے

میں قید کسی طرح کا مواد سے استفادہ کر کے شخصی تاثرات کے ساتھ اپنی سوانح زیست ترتیب دیتا ہے اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے حالات وکوائف حقائق کی روشنی میں بقلم خود تحریر کرتا ہے تو ایسی تحریر خودنوشت سوانح کے زمرے میں شمار کی جائے گی۔

خودنوشت سوانح ایک ایسا فن ہے جس میں انسان اپنے قلم سے اپنی زندگی کے حالات اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نقطۂ نظر اور اپنی پسند و ناپسند کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔خودنوشت سوانح ساری دنیا کے حالات پر محیط کتابی شکل میں ترتیب دی جاسکتی ہے یا چند قابل ذکر واقعات کو ایک مضمون کی شکل میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔بیشتر شاعروں، ادیبوں اور نابغہ شخصیات نے اپنی خودنوشت سوانح سپرد قلم کیں اور ہندوستان کی آزادی میں حصہ لینے والے سیاسی عمائدین نے بھی اپنی خودنوشت سوانح تحریر کیں اور آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی خودنوشت سوانح کے فن اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اُردو ادب میں سیاسی و سماجی خودنوشت سوانح عمری کے نمونے انیسویں صدی کے ربع آخر میں مل جاتے ہیں۔سیاسی خود نوشت سے مراد اُن خودنوشت سوانح سے ہے جنہیں یا تو کسی سیاست یا سماجی شخصیت نے قلم بند کیا ہو یا اُن میں سیاسی و سماجی مسائل زیر بحث آئے ہوں۔سیاسی خودنوشت سوانح نگار اپنے مقصد سے شدید ذہنی و جذباتی لگاؤ رکھتا ہے اور ہر چند اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے نیز اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا ہے اِس لیے یہ ذہنی و جذباتی وابستگی اور تبلیغ، اُس کو جانبداری میں مبتلا کر دیتی ہے، جس کے سبب وہ ہر واقعہ کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اِس لیے مصنف کے حالات زندگی تو صرف ایک زیب داستان کے طور پر بیان ہوتے ہیں

> اصل میں اِس کی خودنوشت کا نقطۂ نگاہ کوئی تحریک یا سیاسی نظریات ہوتے ہیں، جنہیں وہ عوام تک پہنچاتا ہے سیاسی و سماجی خودنوشت سوانح عمریوں میں تاریخی عناصر کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ خودنوشت کا مقصد براہ راست یا بلا واسطہ طور پر کسی تحریک یا کسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہوتا ہے، اِس لیے اُس کے بیانات سیاسی ہوتے ہوئے بھی کافی وقیع ہوتے ہیں۔'' (ص ۱۱۷)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی خودنوشت سوانح کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی مختلف خصوصیات پر مزید لکھتے ہیں:

> دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی و سماجی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک تحریک یا واقعہ مختلف اور متضاد شکل میں نظر آتا ہے، اس کا سبب یہ بھی ہے کہ مختلف اشخاص ایک واقعہ کو اپنی اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں یا واقعات کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کرنے میں اپنی توجہ صرف کردیتے ہیں'' (ص ۱۱۷)

جعفر تھانیسری کی خودنوشت اُردو کی اولین خودنوشت سوانح میں سے ہے جو جعفر تھانیسری کی زندگی کا بڑا حصہ جزائر انڈومان خلیج بنگال میں گزرا تھا۔ یہ خودنوشت سوانح جعفر تھانیسری کی جلاوطنی کے طویل ایام کی مختصر تاریخ ہے۔ اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> جعفر تھانیسری نے اپنے ایام اسیری کے زمانے میں ''تواریخ ''عجیب موسم یہ کالا پانی'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی اِس خودنوشت میں انہوں نے وہابی تحریک کا تذکرہ کیا ہے اور اِس تحریک کے سرگرم کارکنوں کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے نیز

انگریزوں کے مظالم کی روداد بھی بیان کی ہے، اس میں آزادی
کی جدوجہد اور احیائے دین بیک وقت دونوں سے بحث مل
جاتی ہے۔'' (ص ۱۱۸)

پروفیسر ضاء الرحمٰن صدیقی نے اِس ضمن میں جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' کے دیباچہ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''جہاں تک مجھے علم ہیا س مقدمہ (انبالہ) میں ہم لوگوں کی گرفتاری اور اس آیت کی فقط سچ اور جھوٹ کی پرکھ اور آزمائش کے واسطے تھی ورنہ وعدہ حق موجود ہے۔'' وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا '' پس اگر یہ سب آزمائش کا نہ ہوتا تو کبھی سرکار انگریزی کے ہاتھوں ہمیں صدمہ نہ پہنچتا''

جعفر تھانیسری کی مذکورہ بالا خود نوشت میں ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم کا ذکر اور اُس دور کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی مزید لکھتے ہیں:

جعفر تھانیسری نے اس خود نوشت میں اپنے انبالہ کے مقدمہ
اور قید فرنگ کے بیس برس کے حالات و کوائف کو قلم بند کیا ہے
نیز اپنی زندگی کے مذہبی اور سیاسی حالات کو بھی مفصل طور پر
بیان کیا ہے۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اور خصوصاً
وہابیوں کی تحاریک کی مقبولیت، محنت کش اور زبوں حال عوام
کی داستان بیان کی ہے،'' (ص ۱۱۸)

ظہیر دہلوی دبستان دہلی کے مایہ ناز اور منفرد لب و لہجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ایک کامیاب نثر نگار بھی تھے۔ ''داستان غدر'' ظہیر دہلوی کی نثری کاوشوں میں ایک اہم کتاب تصور کی جاتی ہے جسے غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی قابل قدر اور معتبر تاریخی دستاویز خیال کیا جاتا ہے اور یہ ظہیر دہلوی کی ایک مستند خود نوشت سوانح ہے۔

مذکورہ بالا خود نوشت سوانح میں بیان کیے گئے ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

ایک اہم خودنوشت ''داستان غدر'' ہے ،اس کو اردو کی اوّلین خودنوشت تسلیم کیا گیا ہے ،اِس کے مصنف ظہیر دہلوی تھے۔ظہیر دہلوی کی وابستگی بہار شاہ ظفر کے دربار سے رہی،اسی لیے یہ کتاب اُس دور کی سیاسی کشمکش ،امراء و سلاطین کی سراسیمگی کی آنکھوں دیکھی تصویر پیش کرتی ہے۔غدر ۱۸۵۷ء میں جو حالات وقوع پذیر ہوئے ظہیر دہلوی نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بجنسہٖ ان واقعات کا حال بڑی درد مندی اور دل سوزی کے ساتھ سپر دِ قلم کیا ہے اس قیامت صغریٰ سے ان کے خاندان کے افراد بھی محفوظ نہ رہ سکے اُن کے خسر اور چچا انگریزوں کے مظالم کے شکار ہوئے اور انہیں بھی جلاوطنی کی سزا دی گئی ،وہ دربدری اور خانہ بدوشی کی داستان قلعۂ معلیٰ کی رسمی رونق سے شروع کرکے انگریزوں کے مظالم اور یورپیوں کے مظالم پر ختم کر دیتے ہیں۔''(ص ۱۱۹)

سر رضا علی کی خودنوشت ''اعمال نامہ'' اپنے دل نشیں ادبی انداز اور زبان کے اعتبار سے بہت مشہور ہے۔اِس خودنوشت سوانح میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں درپیش سیاسی ،سماجی اور ادبی مسائل پر واضح انداز میں بحث کی گئی ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''اعمال نامہ'' میں پیش کیے گئے سیاسی اور ادبی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اعمال نامہ'' میں پیش کردہ سیاسی حالات اور ادبی مسائل ومباحث پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو سیاست سے جس قدر لگاؤ تھا،اُسی قدر وہ ادب کا بھی دلدادہ تھا سیاسی بصیرت اور ادبی ذوق کا حسن امتزاج ''اعمال نامہ''

کو دوسری خودنوشتوں سے ممیز اور ممتاز بناتا ہے اُس دور میں
مسلمانوں کی ایک اہم جماعت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھی
اِس کانفرنس میں سر رضا علی نے سیاسی سطح پر بڑی اہم خدمات
انجام دیں، اِس کانفرنس کا ایک اجلاس بنگال میں ہونا تھا، اس
سلسلے میں انہوں نے بہار اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک
مرکز پر لانے میں بڑاہ رول ادا کیا'' (ص ۱۲۰)

اِس سیاق میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''اعمال نامہ'' سے ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے، جس میں سر رضا علی لکھتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ لیگ قائم کرنے سے بانیان لیگ کی غرض گورنمنٹ کو امداد دینا یا کانفرنس کی مخالفت کرنا نہیں تھی بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی جن کو ایک طرف گورنمنٹ اور دوسری طرف کانگریس پامال کر رہی تھی، کما حقہ مخالفت کی جائے۔'' چودھری افضل حق سامراجی دور حکومت میں پولیس انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے لیکن وہ وطن کی محبت میں ملازمت ترک کر کے آزادی کی جنگ میں ایک حریت پسند مجاہد کے طور پر شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ملک و قوم کے تئیں چودھری افضل حق کا جذبہ، انگریزوں کا ظلم اور پولیس افسران کے ناروا سلوک کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

۱۹۱۷ء میں چودھری افضل حق کا تقرر سب انسپکٹر پولیس کی
حیثیت سے لدھیانہ میں ہوا تو انہیں ہنگاموں خیز حالات سے
دوچار ہونا پڑا انہوں نے اس دور کے مختلف حالات کو اپنی
کتاب میں قلم بند کیا ہے اُن کی خودنوشت کا بہ نظر غائر مطالعہ
کرنے کے بعد جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور انگریزوں کے ظلم
واستبداد کا پتا چلتا ہے۔ چودھری افضل حق محبّ وطن تھے، اُن
کے دل میں آزادی کا جذبہ کارفرما تھا، ملک و قوم کی خدمت کی

غرض سے انہوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنا شروع کردی، گاؤں گاؤں جا کر تقریریں کیں عوام کو غلامی سے نجات دلانے اور انگریز عملداری کے خلاف اکسانے میں اہم رول ادا کیا نتیجہ کے طور انہیں گرفتار کرلیا گیا طرح طرح سے ایذا پہنچائی گئی'' (ص ۱۲۱)

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے چودھری افضل حق کی خودنوشت ''اعمال نامہ'' سے جو اقتباس نقل کیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت چودھری افضل حق انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، اس وقت تک ہندوستان کے بیشتر مجاہدین آزادی خانۂ زندان کو اپنا جائے سکونت بنا چکے تھے۔ اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مزید لکھتے ہیں:

گرفتاری، جیل کے تلخ تجربات، انگریز حاکموں کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک، وہاں کی مقید اور پابند زندگی کی تصویر، انگریز نما ہندوستانیوں کے سفاکانہ رویے، اِس خودنوشت کے نصف سے زیادہ حصے پر چھائے ہوئے ہیں، بلکہ اِس کتاب کا اختتام بھی جیل ہی کے ایک عجیب و غریب واقعہ کے عنوان کے تحت ہوتا ہے۔ جس جیل میں چودھری صاحب کو رکھا گیا تھا، اتفاق سے اسی جیل میں سردار بھگت سنگھ بھی تھے۔ بھگت سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ میری تقریر و ترغیب کی بنا پر تحریک آزادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جیل میں سیاسی قیدیوں کے دو گروہ تھے ایک گاندھی جی کے ''اہنسا'' پر گامزن تھا اور دوسرا حسرتؔ موہانی کا ماننے والا تھا۔'' (ص ۱۲۲)

نواب احمد سعید خاں چھتاری کی خودنوشت ''یادِایام'' اُس خواہش کی تکمیل ہے جس میں اُن کا خیال تھا کہ عمر کی آخری منزل پر پہنچنے کے بعد صدائے بازگشت کی طرف دیکھا جائے نیز تلخیٔ ایام کے تصور سے قلب میں اُن جذبات کو تلاش کیا جائے جن سے گزرے زمانے میں اُن کی زندگی متاثر ہوئی۔نواب احمد سعید خاں چھتاری کی خودنوشت، اُن کی شخصیت اور ہندوستان کی آزادی و دیگر مسائل سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> نواب احمد سعید خاں چھتاری نے ''یادِایام'' کے عنوان سے اپنی خودنوشت تحریر کی تھی۔''یادِایام'' سیاسی خودنوشتوں میں ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہے۔یہ نواب صاحب کی شخصیت اور ہندوستان کی آزادی اور وطن کے دیگر مسائل پر روشنی ڈالتی ہے اِس میں انہوں نے انگریز حاکموں کی رعونت اور انسان شناسی کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔اِس کے دوسرے حصہ میں دوگول میز کانفرنسوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے جو اس دور کی سیاست پر روشنی ڈالتا ہے۔'' (ص۱۲۲)

اِس کے ذیل میں پروفیسر صدیقی نے نواب صاحب کی خودنوشت سے ایک مختصر اقتباس نقل کیا ہے جس کی رو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انگریزوں حاکموں کا رویہ، ہندوستان کے عوام کے ساتھ کتنا تذلیل اور تضحیک آمیز تھا۔پروفیسر صدیقی نے ایک اور اقتباس نقل کیا ہے جس میں نواب صاحب ''تحریک ترک موالات'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اِس تحریک نے ہندوستانیوں میں شعور پیدا کیا، اُس سے پہلے سوائے چند حضرات کے فقدان تھا۔اس سیاسی شعور سے ہندوستانیوں میں خودآرائی آئی، اِس تحریک نے انگریزوں کے دماغ سے دعویٰ خدائی کو بڑی حد تک دور کر دیا اور ان کے مزاج میں اس تحریک نے اعتدال پیدا کیا، ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی چیزوں کی طرف مائل کیا۔''

عبدالمجید سالک بٹیالوی بحیثیت شاعر، صحافی اور کالم نگار روزنامہ ''انقلاب'' میں ایک

کالم بعنوان ''افکار و حوادث'' لکھتے تھے، بعد میں یہی کالم ان کی پہچان بن گیا، اُن کی خودنوشت سوانح ''سرگزشت'' کے نام سے شائع ہوئی۔ ''سرگزشت'' میں سیاسی اور ادبی احوال اور اُس دور کے تمام واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی رقم طراز ہیں:

اِس ''سرگزشت'' میں سیاسی اور ادبی ہندوستان بری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔سالک نے اپنی خودنوشت میں سیاسی معلومات فراہم کی ہیں اور اُس عہد کے تمام واقعات اور حادثات کو پوری طرح شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے گاندھی اور رولٹ ایکٹ ۳۰/مارچ ۱۹۱۰ء کی ملک ہڑتال جلیانوالہ باغ کا حادثہ،مسلم لیگ،خلافت کانفرنس،تحریک عدم تعاون ،مولانا محمد علی کا وفد یورپ کے لیے مالویہ جی اور شردھانند کی تحریک ، سنگھٹن اور شدھی ،امرتسر میں تنظیم کانفرنس جس کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے منعقد کیا تھا۔ بندے ماترم پرتاپ اور ملاپ کا اجرا،نہرو رپورٹ اور اس کا ردعمل،اخبار انقلاب اور زمیندار کے مضامین ،غرض کہ اس دور کی پوری ملکی اور ملّی تاریخ ان کے فکر وفن کا محور ہے۔اس طرح سالک کی سرگزشت اپنے دور کے سیاسی حالات اور تحریکوں کا آئینہ دار ہے۔''

(ص۱۲۳)

خودنوشت کے حوالے سے عبداللطیف بٹالوی کا نام اس لیے اہم ہے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت ''لطیف کی کہانی'' میں آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے ضمن میں اُن اہم شخصیات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے اور اُس دور کی سیاسی تاریخ قلم بند کی ہے۔اِس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

عبداللطیف بٹالوی کا نام ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں

خصوصیت کا حامل ہے ۔اپنی خودنوشت میں عبداللطیف نے اہم سیاسی شخصیتوں مثلاً ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہر، مولانا شوکت علی وغیرہ کے اعمال وافعال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔لطیف کی کہانی،اُس دور کی سیاسی تاریخ کی دستاویز ہے اِس خودنوشت میں انہوں نے ۱۹۱۹ء کی ہڑتال،شدھی اور نہرو رپورٹ ،کانپور انکوائری رپورٹ،۱۹۳۶ء کا لا یکشن زمینداروں کی حالت، یوپی کی تقسیم کا مسئلہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے علاوہ ازیں نہر،انصاری،سندرلال،شوکت علی اور پنڈت گوبند بلبھ پنت وغیرہ کے خطوط کو بھی درج کیا ہے جس سے ان حضرات کی سیاسی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔'' (ص۱۲۴)

۱۹۴۲ء میں انگریز حکومت کے ذریعے نمک مارچ کے لیے پابند سلاسل کیے جانے والے ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی اپنی خودنوشت ''اپنی کہانی'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ مذکورہ خود نوشت کے بارے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ''اپنی کہانی'' کے نام سے خودنوشت لکھی تھی اس خودنوشت کا ترجمہ گوپی ناتھ امن نے کیا تھا اور ساہتیہ اکادمی نے پہلی بار مئی ۱۹۶۱/ء میں اس کتاب کو شائع کیا تھا۔اِس کتاب میں راجندر پرساد نے پہلی جنگ عظیم،رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک پنجاب میں ترک موالات،موپلہ بغاوت،ستیہ گرہ کی تیاری، چوراچوری کا سانحہ،سوراج پارٹی کا جنم ،ہندو مسلم مسئلے سائمن کمیشن کی آمد،گاندھی جی ڈانڈی یاترا،نمک ستیہ گرہ ،مسلم لیگ کا قیام وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔راجندر پرساد کی خودنوشت کا مطالعہ کرنے کے

بعد سیاسی تحریکات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

(ص ۱۲۵)

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے خودنوشت "اپنی کہانی" سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ گاندھی جی سے گہرے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں وکالت تو زوروں سے کرتا رہا مگر اب گاندھی جی سے بھی تعلق چھپنے والا نہیں تھا۔ رولٹ ایکٹ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد ملک میں ایک بڑی تحریک جاری ہوگئی، گاندھی جی نے اس کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لی بہار سے واپسی کے بعد گاندھی جی نے رہنمائی کر کے کھیڑا کے کسانوں کا جن پر مال گزاری کا اضافہ تھا اور ستیہ گرہ کا اہتمام کرنا پڑا، جب گاندھی جی ۱۹۱۰ء میں کھیڑا کا دورہ کر رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ گجرات کے کسانوں کے اس ضلع میں دو تین دن تک گھوما پھرا تھا۔"

گاندھی جی کی خودنوشت "تلاش حق" کئی حصّوں میں منقسم ہے، پہلا حصّہ ابتدائی اورلندن کی زندگی پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ بحیثیت وکیل کی زندگی اور دیگر معاملات سامنے آتے ہیں اور اِسی حصے میں وہ ہندوستان آتے ہیں اور آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں لگ جاتے ہیں، کتاب کے تیسرے حصے میں بھی جنوبی افریقہ کا ذکر ملتا ہے۔ گاندھی جی کی خودنوشت سماجی اور تاریخی دونوں لحاظ سے کافی اہم ہے۔ سماجی اور سیاسی سطح پر کیا تغیرات سامنے آرہے تھے، اس کا عکس ان کی خودنوشت میں مل جاتا ہے۔ اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> گاندھی جی نے اپنی خودنوشت انگریزی میں لکھی تھی جس کا ترجمہ "تلاش حق" کے عنوان سے ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا تھا۔ گاندھی جی نے اپنی خودنوشت میں سیاسی رہنماؤں کی مختلف تحریکوں میں شمولیت کا تذکرہ کیا ہے۔" (ص ۱۲۶)

اِس سیاق میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے گاندھی جی کی خودنوشت "تلاش حق" سے کئی اہم اقتباسات نقل کیے ہیں جس میں گاندھی جی تحریک ستیہ گرہ، تحریک ترک موالات وغیرہ اور مولانا شوکت علی اور پنڈت نہرو جیسے جید سیاسی رہنماؤں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبارِ خاطر'' حالانکہ مکاتیب کا مجموعہ ہے لیکن بعض محققین نے اُسے طرزِ نگارش کی وجہ سے خود کلامی یا خودنوشت نگاری کی خصوصیات بھی تلاش کی ہیں تاہم پروفیسر صدیقی اپنا تحقیقی نقطۂ نظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

> مولانا ابوالکلا آزاد نے INDIA WINS FREEDOM کے عنوان سے دو حصوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی، اِس کتاب کے ایک حصے کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد مجیب نے ''ہماری آزادی'' کے نام سے کیا تھا اس کتاب کا نصف سے زیادہ حصہ ان کی خودنوشت پر پھیلا ہوا ہے، اس کے علاوہ باقی حصہ مولانا کی سیاسی تحریک سے وابستگی پر محیط ہے'' (ص ۱۲۸)

پنڈت جواہر لعل نہرو کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ بیک وقت اعلیٰ سیاست داں قانون داں مفکر ہیں۔ وہ ۱۹۳۵ء میں جب الموڑہ کی جیل میں پابند سلاسل کیے گئے تو انہوں نے اِس دوران میں اپنی مشہور کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا''، مکمل کی، علاوہ ازیں انہوں نے اپنی آپ بیتی بھی تحریر کی ہے۔ اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی ''میری کہانی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اِس کتاب میں انہوں نے گول میز کانفرنس، گاندھی جی سے ملاقات، درجۂ نوآبادیات، کامل آزادی انگریز حکومت کی کارگزاری کے علاوہ سیاسی تحریکوں میں اپنی شمولیت کا ذکر مفصل طور پر کیا ہے۔'' (ص ۱۲۸)

اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے پنڈت نہرو کی آپ بیتی ''میری کہانی'' سے دو اہم اقتباس بھی نقل کیے ہیں جس میں پنڈت نہرو برطانوی حکومت کی سازشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ

پرست اور مطلب پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے مگر شاید یہ بھی ہمارے ملک کے لیے ایک ضروری آزمائش ہے اور ہندوستان کو نئی زندگی، اُسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے، جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے۔''

مولانا حسین احمد مدنی نے آزادیٔ ہند کی کئی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے قائدانہ کردار ادا کرتے رہے تھے۔

انہوں نے اپنی خودنوشت بھی مرتب کی تھی، جس کے متعلق پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> مولانا حسین احمد مدنی نے ''نقش حیات'' کے عنوان سے اپنی خودنوشت دو جلدوں میں مرتب کی تھی۔ ''نقش حیات'' کا ایک حصہ مولانا کے شب و روز کی زندگی، والدین، اعزہ اور لواحقین کے حالات پر مشتمل ہے، باقی صفحات میں ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم اور استبداد کی داستان پیش کی گئی ہے۔'' (ص ۱۲۹)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''نقش حیات'' سے دو اقتباس نقل کیے ہیں جس میں مولانا انگریزوں کی ظالمانہ کارروائیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''مجاہدین یا ان سے تعلق رکھنے والوں یا مشتبہ لوگوں پر مقدمات میں جس قدر مظالم، ایذا رسانی، توہین و تذلیل، مار پیٹ وغیرہ خلاف انسانیت اور خلاف تمدن کارروائیاں کی جاتی تھیں، اُن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ''نقش حیات'' کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ ''مولانا نے انگریزوں کے مظالم علاوہ، انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے انخلاء تک پوری تاریخ بیان کی ہے اِس میں انہوں نے دیوبند کے اکابرین کی آزادی کی تحریک میں شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مہاجر مکی کی گرفتاری کے حالات، مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خودنوشت میں تحریر کیے ہیں۔''

اگر اردو سوانح عمری لکھنے کی روایت پر بات جائے تو سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک

کے بعد اردو میں سوانح نگاری کی باقاعدہ ابتدا ہوئی، مغربی اثرات کے نفوذ کے بعد اردو ادب میں سوانح کی ابتدائی کوششوں میں کسی حد تک مناظرانہ رنگ پایا جاتا ہے البتہ مولانا الطاف حسین حالؔی ہی وہ شخصیت ہیں جنہیں اُردو میں اوّلین نقاد ہونے کے ساتھ، پہلے سوانح نویس ہونے کا شرف حاصل ہے۔

جیسا کہ بر سبیل تبصرہ واضح ہو چکا ہے کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس باب کا دوسرا حصہ سوانح عمری پر قائم کیا ہے۔ موصوف اِس ضمن میں اہم حوالوں کے ساتھ سوانح نگاری کی روایت اور اُس کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سوانح عمریاں لکھنے کا تصور سب سے پہلے یہودیوں کے یہاں ملتا ہے، یہودیوں نے ابتدا میں اپنے اسلاف اور قدما کے حالاتِ زندگی جمع کیے، اُس کے بعد آہستہ آہستہ اہل روما میں بھی یہ صنف رواج پانے لگی، اِس طرح دن بدن سوانح عمریاں لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلی سوانح عمری جو دوسری صدی میں عیسوی میں لکھی گئی ''پلو ٹارک'' کی ہے، اِس سوانح عمری کو بظاہر اعلیٰ اور وقیع قرار دیا گیا۔'' (ص ۱۳۱)

سوانح عمری میں کسی معروف شخص کی زندگی کے محاسن اور معائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں سوانح میں مستند اور جامع مواد پیشکش ضروری قرار دی گئی ہے بلکہ اُس کے ساتھ، اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص پر سوانح لکھی جا رہی ہے، اُس کی زندگی کے تمام و کمال کارناموں کو کتاب میں بالترتیب بیان کر دیا جائے اگر کتاب میں محض محاسن و کمالات بیان کیے جائیں تو ایسی سوانح عمری ادبی اعتبار سے اپنے معیار کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی سوانح کی ادبی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کامیاب سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ جس شخص پر قلم اٹھا رہا ہے اس کی زندگی کا کوئی بھی اہم گوشہ ضبط تحریر میں لانے سے نہ رہ

جائے اور وہ معروضی ہو کر اس شخص اور سیرت کا بھرپور جائزہ
لے۔‘‘(ص ۱۳۱)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اُردو میں فن سوانح عمری کی روایت اور اس کے ارتقائی دور پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اُردو فن سوانح عمری کی ابتدا سر سید احمد خاں کے رفقا کی رہین منت ہے۔ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر رفقا کا ایک ایس حلقہ تیار کیا تھا جنہوں نے اپنے اپنے میدانوں میں قلم کے جوہر دکھائے ،اُس دور میں جہاں ادب کی دیگر اصناف کو فروغ حاصل ہوا وہاں فن سوانح نگاری پر بھی توجہ صرف کی گئی۔ سر سید کے رفقا میں مولانا شبلی نے خصوصیت سے تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کو اپنا میدان بنایا، حالؔی نے تنقید نگاری اور شاعری کے علاوہ سوانح عریاں بھی تصنیف کیں انہوں نے یادگار غالبؔ، حیات سعدی اور حیات جاوید تصنیف کی، شبلی کے اسلاف عظیم کارناموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ان کے حالات قلم بند کیے۔‘‘(ص ۱۳۲)

دارالمصنفین کی پہچان عالم ادب میں تحقیق، ترویج و اشاعت کے اہم مرکز کے طور پر مستحکم ہے علامہ شبلی نعمانی نے نو آموز قلم کاروں کے لیے ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی جہاں کثیر تعداد میں تحقیقی کام کیا گیا، اس پر پروفیسر صدیقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

سوانح نگاری میں دارالمصنفین کا سوانحی سلسلہ بھی بڑی اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے ۔اِس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی سید سلیمان ندوی ،مولانا عبدالسلام ندوی ،شاہ معین الدین احمد ندوی بطور خاص قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ

مرزا حیرت دہلوی اور عبدالرزاق کانپوری کے یہاں بھی حالی
اور شبلی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔''(ص۱۳۲)

واضح رہے کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مذکورہ باب میں صرف انہیں سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا ہے جو سیاسی شخصیات پر لکھی گئی ہیں یا پھر جن شخصیتوں کا تعلق آزادئ ہند کی جدوجہد سے رہا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے محمد علی جناح پر لکھی گئی چند سوانح عمریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وقار حیات'' محمد اکرام اللہ خاں ندوی نے مرتب کی تھی جو ۱۹۲۸ء میں منظر عام پر آئی ،قائد اعظم محمد علی جناح پر متعدد کتابیں لکھی گئیں اُن کتابوں میں سے زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں جو فنی اور سیاسی اعتبار سے کامیاب اور بھرپور نظر آتی ہیں ''حیات محمد علی جناح''، رئیس احمد جعفری نے لکھی تھی جو ۱۹۴۶ء میں بمبئ سے شائع ہوئی ،اِسی طرح ایک سوانح عمری خالد اختر افغانی نے ''حالات قائد اعظم'' کے عنوان سے تحریر کی تھی یہ کتاب بھی بمبئ سے شائع ہوئی تھی ''ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت:محمد علی جناح'' کے نام سے محمد عبداللہ منہاس نے ایک سوانح تصنیف کی جو امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی اِس کتاب میں قائد اعظم کی شخصیت کو سیاسی اور قومی رہنما کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے۔اِس طرح کی کتابیں سوانح عمریوں کی شکل میں کثرت سے لکھی گئیں۔''(ص۱۳۳)

مولانا ابوالکلام آزاد محض ایک سیاست داں ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک دانشور بھی تھے۔غالباً پہلے شخص تھے، جنہوں نے مذہب اور سیاست کو شیر وشکر کر دیا تھا،موصوف کی شخصیت پر تعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں جن پر پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مستند حوالوں کی روشنی میں لکھتے ہیں:

مولانا ابوالکلام آزادؔ کا نام جنگ آزادیٔ ہند کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، وہ ایک کثیر الجہات اور مجمع الصفات کے مالک تھے ابوالکلام آزاد پر بھی کثرت کے ساتھ کے ساتھ کتابیں اور سوانح عمریاں تصنیف کی گئیں، ان کتابوں میں مولانا کے سیاسی افکار او نظریات کو بالخصوص بیان کیا گیا ہے اُن میں مولانا شائق احمد عثمانی کی کتاب ''امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزادؔ'' ہے جو ۱۹۲۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔''

(ص ۱۳۳)

مولانا ابوالکلام آزادؔ پر اور بھی اہم کتابیں اور سوانح عمریاں مختلف لوگوں نے لکھی ہیں جن پر پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں:

عبداللہ بٹ نے ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے نام سے اردو میں دو کتابیں لکھیں، ایک کتاب لاہور سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی اس میں مولانا آزادؔ کی حیات، تصنیفات اور ان کے سیاسی کارناموں پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے دوسری کتاب جو مولانا آزادؔ پر مختلف افراد کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ لاہور سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوئی تھی ''ابوالکلام آزادؔ'' کے نام سے روشن نے مولانا آزادؔ کے خاندانی حالات سوانح حیات، علمی، مذہبی اور سیاسی خدمات کے تعارف پر مبنی کتاب تحریر کی، یہ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی، اس کتاب میں مولانا آزادؔ کے مفصل حالات، الہلال کے مضامین مختصر مقدمہ کراچی اور خطبۂ صدارت شامل ہیں منشی عبدالرحمٰن شیدا نے ''سوانح ابوالکلام آزادؔ'' تحریر کی، یہ بھی مولانا آزادؔ

کے علمی ، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے
آخر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ۵۳ ویں اجلاس منعقدہ
رام گڑھ کا خطبہ صدارت بھی شامل ہے، یہ کتاب دہلی سے
شائع ہوئی تھی۔ابوسعید بزمی نے ''مولانا ابوالکلام'' تحریر کی یہ
لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی، اِس میں مولانا آزاد کی علمی
سیاسی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے'' (ص۱۳۴)

علامہ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں خوب محبوبیت اور مقبولیت نصیب ہوئی اور اقبال شناسوں نے اُن کی شخصیت، فکروفن، فلسفہ اور اُن کے سیاسی نظریات کو موضوع بنا کر متعدد کتابیں تحریر کیں، اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

علامہ اقبال پر بھی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں، علامہ اقبال
شاعر، فلسفی اور مفکر ہونے کے علاوہ سیاست داں بھی
تھے، انہیں اپنے ملک سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا۔ محمد دین
تاثیر نے ''اقبال پر ایک نظر'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی
تھی جو ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔عنایت اللہ نے
''حیات اقبال'' لکھی جو ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی، اس کے علاوہ بھی
اقبال پر متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں، اِن کتانوں میں اقبال کے
سیاسی اور ادبی کارناموں کا تذکرہ بالخصوص ملتا ہے۔'' (ص۱۳۴)

علاوہ بریں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس باب کے آخر میں سوانح عمریوں کے علاوہ چند ایسی کتابوں کا ذکر، برسبیل تذکرہ کیا ہے جن میں علماء اور قائدین کے تذکروں کے ساتھ سیاسی نظریات اور مذہبی شعور کو موضوع تحریر بنایا گیا ہے، اِن میں مولانا محمد میاں کی ''علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' اور مہادیو ڈیسائی کی ''خدائی خدمت گار'' محمد عنایت اللہ کی ''تذکرہ فرنگی محل'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔سیاسی عمائدین، قائدین اور مبلغین پر سوانحی کتابوں کی

اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اِس سلسلے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کئی اہم کتابوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ پیش کیا ہے جن میں مختلف نظریات و مذاہب کے حامل قومی و سیاسی اکابرین کا ذکر ملتا ہے۔ اِن میں مہری کی کتاب ''ہندوستانی لیڈر''، جگدیش سنگھ کی ''محبان وطن''، بادشاہ حسین کی ''مشاہیر ہند'' اور ''باغی لیڈر'' جس کے مرتبین اچاریہ کرپلانی، کے. ایم منشی اور یوسف میر علی شامل تھے، قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر صدیقی نے اُن کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں مالویہ جی، لالہ لاجپت رائے، سروجنی نائڈو، ٹیگور سریندر ناتھ بنرجی، گوکھلے، ڈاکٹر ذاکر حسین، مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں وغیرہ سیاسی رہنماؤں پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جو سوانح عمریوں کی شکل میں موجود ہیں اور اُن میں سیاسی عمائدین کے کارناموں اور مسلم قوم کے لیے ان کی سیاسی خدمات کا ذکر ملتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے زیرِ نظر تصنیف ''تحریک آزادی اور اردو نثر'' کا باب ہشتم (آخری باب) ''تحریک آزادی اور اُردو صحافت'' پر قائم کیا ہے۔ موصوف نے مذکورہ باب میں ۱۸۵۷ء سے لے کر آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء تک کے اخبارات اور رسائل و جرائد پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جن کا مرکز نگاہ صریحاً سیاسی تھا اور جن کے مدیران نے براہ راست برطانوی حکومت کی نا انصافیوں اور مظالم کے خلاف لکھا نیز اپنی تحاریر کی وساطت سے عوام میں حریت کا جذبہ اور قومی شعور کی آبیاری کی۔

بہر کیف راقم الحروف پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی دوسری شاہکار تصنیف ''اسالیب فکر'' کے متنی تجزیہ میں مذکورہ بالا موضوع پر خاطر خواہ گفتگو کر چکا ہے، لہٰذا طلبہ اور باذوق قارئین وہاں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی ''تحریک آزادی اور اُردو نثر'' کی مکمل قرأت کے بعد یہ کہنا مشکل نہیں کہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی محنت شاقہ و تحقیقی انتقاد اور ژرف بینی سے اِس کتاب کی تیاری میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اور مختلف تخلیقی و غیر تخلیقی نثری اصناف اور مختلف تحریکات سے آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے نقوش تلاش کرنے کے بعد جنگ آزادی کا تمام و کمال منظر نامہ پیش

کر دیا ہے۔ اُردو نثر کے حوالے سے تحریک آزادی ہند کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ معیاری اور مکمل تصنیف ہے۔ اس سے قبل اِس موضوع پر اس نوع کی تحقیق پہلی بار شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے جو یقیناً اُردو نثر میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

❁❁

معروضات: ایک تنقیدی جائزہ

جیسا کہ دیگر تبصروں میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی غیر معمولی علمی وادبی، تحقیقی ،تنقیدی اور تدریسی صلاحیتوں کا تذکرہ اور علم دوستی کا ذکر بر سبیل تبصرہ آچکا ہے، جس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> صدیقی صاحب کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے۔ ان کی علم سے لگن ۔جب بھی کوئی طالب علم پی.ایچ.ڈی کر کے لیکچرر ہوتا ہے تو کتابوں اور پڑھنے پڑھانے سے اس کا تعلق بالکل ختم ہو جاتا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ صدیقی صاحب کے علمی مشاغل میں غیر معمولی اضافہ ہے ہوا ہے۔'' (پیش لفظ ''معروضات'')

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی کتاب ''معروضات'' اُن مضامین کا انتخاب ہے جو کئی برسوں کے دوران مختلف موقعوں کے لیے ضبط تحریر میں لائے گئے تھے، جن کا تعلق کسی مکتب فکر یا تحریک سے نہیں ہے بلکہ موضوعات سے دل آویزی کے باعث انہیں تحریر کیا گیا تھا۔ کتاب میں شامل سبھی مضامین توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہیں۔ اِن میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں نئے پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اب تک پردۂ خفا تھے۔

کتاب کا پہلا مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاؔد کا صحافتی کردار'' ہے۔حالانکہ

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی، سیاسی اور صحافتی خدمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اِس حوالے سے صرف چند تعریفی کلمات پر اکتفا کرنا یا پھر کچھ پیش رو مصنفین کی رائے کی گردان کرنا غیر تشفی بخش ہوگا، کیونکہ مولانا نے اردو زبان کو اپنی منفرد نگارشات سے نہ صرف مالا مال کیا بلکہ اُسے نئی راہوں سے متعارف کرایا، اظہار و خیال کو نئی جدتوں وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار کیا، افکار و جذبات میں جدت طرازی کی، اردو زبان ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

جس دور میں مولانا آزاد نے اردو صحافت میں قدم رکھا، اُس دور میں سیاست اور ادب کا رخ فکر انگیز لوگ ہی کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں صحافت صرف ایک بزنس، ایک ذریعہ حصول دولت وسیاسی شعبدے بازی نہ تھا اور نہ ہی ایک پیشہ، نہ اخبارات اہل ثروت نکالتے تھے، غرض کہ صحافت نفع کمانے کا وسیلہ نہ ہوکر ایک مشن تھا۔ مدیران خود اخبار جاری کر کے اپنا سرمایہ صرف کرتے تھے اور اکثر وبیشتر خسارہ بھی برداشت کرتے تھے۔ اِس سیاق میں پروفیسر صدیقی نے اپنا نقطۂ نظر اس طرح بیان کیا ہے:

> بیسویں صدی کے اوائل میں پورا ہندوستان سیاسی بحران میں مبتلا تھا انگریزوں کے معاندانہ رویے اور جبر واستبداد نے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو پامال کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں، اِس بحرانی دور میں اردو کے ایک ایسے اخبار کی ضرورت تھی جو ہندوستانیوں میں قومی شعور کو بیدار کر کے ان کے عزم وارادوں کو مستحکم بنا سکے اور حریت پسندوں کا پیغام پورے ملک میں پہنچوا سکے اور ملک گیر سطح پر مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے۔'' (ص ۱۴)

مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہی اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ صحافت ہی ترسیل وابلاغ کا موثر اور طاقتور ذریعہ ہے۔ اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی مولانا آزاد کے بارے میں اِس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

مولانا آزادؔ کا ذہن ایک عالم کا ذہن تھا۔ان کا مزاج ایک مفکر کا مزاج تھا ان کی اصابت فکر ایک فلسفی کی فکر تھی لیکن وہ بنیادی طور پر صحافی تھے ،اسی لیے ان کی طبیعت کا رجحان ابتدا ہی سے اخبار نویسی کی طرف مائل رہا انھوں نے اپنی تحریروں کا آغاز اخبارات میں مضامین لکھ کر کیا۔‘‘(ص۱۳)

اِس مقالہ میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزادؔ کی صحافتی زندگی کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

مولانا آزادؔ نے ایسے دور میں اردو صحافت میں قدم رکھا جب ہندوستان سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا مولانا ابوالکلام آزادؔ نے ۱۸۹۹ء میں ’’نیرنگ عالم‘‘ کے نام سے ایک گلدستہ جاری کیا،اس پرچہ میں صرف شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا،نثر کا حصہ شامل نہیں کیا گیا تھا۔’’نیرنگ عالم‘‘ بند ہوجانے کے بعد مولانا آزادؔ نے اخبار’’مصباح الشرق‘‘ کی تقلید میں ۱۹۰۱ء میں ’’المصباح‘‘ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا، یہ اخبار عید الفطر کے دن جاری ہوا تھا اسی لیے اس کا اداریہ بھی عید کے عنوان سے تھا۔تین مہینے بعد المصباح بھی بند ہوگیا۔(ص۱۳تا۱۴)

مولانا ابوالکلام آزادؔ اردو صحافت کے ابتدائی زمانے میں ذاتی اخبارات کے علاوہ دوسرے کئی اخبارات ورسائل سے بھی منسلک رہے،جس کی تحقیق میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

مولانا آزادؔ نے ابتدائی صحافتی مشن کے دوران متعدد اخبارات اور رسائل میں ادارت کے فرائض انجام دیے،ان اخبارات میں خدنگ نظر،مخزن لاہور،احسن الاخبار کلکتہ،مرقع عالم،محمدیہ

،دارالسلطنت کلکتہ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔''(ص۱۴)

ہفت روزہ ''الہلال'' مولانا آزاد نے حکومت برطانیہ کے جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے نیز ایک تحریک کی شکل میں جاری کیا تھا۔مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے ذریعے مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شریک ہونے کی نہ صرف تلقین کی بلکہ ہندوستانیوں میں قومی شعور بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

اردو صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بڑا کارنامہ ''الہلال'' کا اجرا تھا۔اِس اخبار کا اجرا ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا ہفت روزہ ''الہلال'' ٹائپ میں شائع ہوا تھا۔اس میں مذہبی سیاسی،تاریخی،ادبی سوانحی نیز جغرافیہ سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔''الہلال'' ایک تحریک کی شکل میں رونما ہوا،جس نے ہندوستانیوں کے ذہنوں کو متحرک کر کے عوام میں قومی شعور بیدار کیا مولانا نے ''الہلال'' میں ایسے مضامین لکھے جس نے ہندوستان کے عالموں اور ادیبوں کو متاثر کیا علامہ شبلی اور مولانا حالی جیسے صاحب طرز ادیب بھی مولانا کی عالمانہ تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔''(ص۱۷)

مقالہ کے آخر میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اُن کے اسلوب میں،اُن کی شخصیت اور ان کی شخصیت میں ان کا اسلوب واضح طور پر نظر آتا ہے۔یہ سب کچھ ان کی قوت آخذہ ،وسیع مطالعہ، گہرے شعور اور غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے تھا۔اگر چہ مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاست میں گزرا لیکن ان کی شہرت اور بزرگی کی بنیادی وجہ ان کے علمی و ادبی کارنامے ہیں۔''

❀❀

تحریک آزادی اور پریم چند

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''معروضات'' میں دوسرا مقالہ ''تحریک آزادی اور پریم چند'' شامل کیا ہے جو نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ پروفیسر صدیقی نے پریم چند کے افسانوں میں وہ گوشے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن سے تہذیبی و معاشرتی تصادم کے علاوہ اصلاح کی خواہش نیز پریم چند کے سیاسی نظریات اور انقلاب کی طرف بڑھتے قدم اور ان کے جذباتی پہلو سامنے آتے ہیں۔

بالخصوص اردو افسانہ نے برصغیر میں سیاسی انتشار کے زمانے میں جنم لیا، اسی لیے اردو افسانہ اُس دور کی گہما گہمی کا صحیح عکاس بن کر سامنے آیا اور پریم چند نے بھی اسی دور میں افسانے اور ناول تخلیق کرنے شروع کیے۔ اس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> پریم چند کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا، اُس وقت سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں ۔لوگ آزادی کے گیت گا رہے تھے ادھر گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی منظرنامے میں اپنا مقام بنا رہے تھے پریم چند بھی گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے نتیجہ کے طور پر پریم چند نے ملک وقوم کی خدمت کی غرض سے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔''
>
> (ص ۳۵)

اسی سیاق میں پروفیسر صدیقی نے رسالہ ''زمانہ'' (کانپور) کے پریم چند نمبر سے پریم چند کی تحریر کا ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''مہا گاندھی کے درشنوں کی برکت تھی کہ میرے جیسے مردہ دل آدمی کے دل میں جان آ گئی، میں نے اپنی بیس سالہ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے نزدیک پریم چند کو سفید فام اور نوآبادیاتی تسلط، برصغیر کی تاریخی وتہذیبی روایات کی معاشرتی زندگی اور اخلاقی قدروں کا زیاں نظر آتا ہے۔ اسی لیے پریم چند کے فن پاروں میں اپنے عہد کے حالات و واقعات اور حب الوطنی کا پرتو نظر آتا ہے۔ پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں، وہ محبّ وطن تھے انہیں اپنے وطن کی ہر چیز سے بے پایان محبت اور لگاؤ اور عقیدت تھی۔ ان کے ناول اپنے عہد اور خصوصاً بیسویں صدی کے سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے بہترین ترجمان ہیں انہیں وطن سے محبت تھی، اس لیے ان کے ناولوں میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔'' (ص ۳۶)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے خیالات کے ذیل میں رسالہ ''زمانہ'' (کانپور) کے پریم چند نمبر سے عبدالماجد دریا آبادی کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''شیطنت کی چالوں کا احساس اور وطن کا صحیح جذبہ، ایثار وخلوص اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو تو ایسی شیریں اور خوشگوار کونین پریم چند کے دواخانے میں دستیاب ہو سکتی ہے اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس سال بعد لکھے گا تو اس کو تیس بتیس سال کی تاریخ سمجھنے کے لیے جہاں گاندھی جی، موتی لال نہرو، داس، محمد علی، انصاری اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں لازمی ہوں گی وہاں پریم چند کی تحریریں بھی ناگزیر ہوں گی۔''

پریم چند کے دور میں ہندوستان میں سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں، اسی لیے پریم

چند کے افسانوں اور ناولوں میں اپنے عہد کے سماجی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی ناول نگاری کو سب سے بڑی تحریک ہندوستان کی سیاسی فضا سے ملی ، یہی وجہ ہے کہ ان کے فن پاروں میں اپنے زمانہ کا بھرپور سیاسی شعور ملتا ہے۔ پریم چند نے جن سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل پر اپنی تخلیقات کی بنیاد رکھی ،وہ ان کے آفاقی ذہن اور حب الوطنی کے احساس کا پتہ دیتی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> پریم چند نے اپنی تحریروں اور ناولوں کے ذریعہ آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیا،گوشۂ عافیت اور میدان عمل گاندھی جی کے نظریات وخیالات کی نمائندگی کے لیے لکھے گئے بالواسطہ طور پر پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعہ گاندھی جی خیالات کو تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا،اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پریم چند گاندھی جی کے نظریات سے براہ راست متاثر تھے۔‘‘(ص ۳۷)

پریم چند کے فن پارے موضوع کے اعتبار سے وسعت کے حامل ہیں ، بالخصوص اُن کے ناولوں میں اپنے دور کی سماجی ،سیاسی اور تہذیبی تاریخ بکھری پڑی ہے۔ان کے پسندیدہ موضوعات میں حب الوطنی کا موضوع آگے چل کر سیاسی اور قومی بیداری کی تحریکوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اُن کے موضوعات کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس طرح روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پریم چند کے ناول’’میدان عمل‘‘ میں اُس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور عوام میں غیر ملکیوں کے خلاف باغیانہ رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔’’میدان عمل‘‘ کے کردار اُس دور کے ہندوستان کی سیاست اور حکمراں طبقے کے مظالم اور غیر ملکی حکومت کے بے جا تسلط سے نجات کے طلب گار ہیں اور اپنے

عہد کی سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''چوگان ہستی'' میں پریم چند نے مختلف کرداروں کی زبان سے گاندھی جی کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔'' (ص ۳۸)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے خیالات کی روشنی میں ناول ''میدان عمل، چوگان ہستی اور ''گئودان'' سے کئی اہم اقتباسات بھی نقل کیے جن میں اُس دور کے سیاسی موضوعات اور مسائل سے بحث، کرداروں کی تحریکوں میں حصہ لینے اور اپنے وطن سے بے پایاں محبت وعقیدت کے نشانات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور خاص طور پر ''چوگان ہستی'' میں آزادی سے قبل کے سماجی اور معاشی پہلوزیر بحث آئے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے مطابق پریم چند آزادی ہند کے نقیب تھے اور ہندوستان کی بیداری اور آزادی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہندوستان حصول آزادی میں جس منزل سے گزر رہا تھا اس کے نقش پا پریم چند کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

پریم چند نے افسانہ نگاری کے میدان میں ایسے دور میں قدم رکھا جب ہندوستان سیاست کی آگ میں جل رہا تھا۔ انگریز حکمراں ہندوستان کے عوام کو نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ملک افراتفری کے عالم میں مبتلا تھا۔ حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور ان کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پریم چند نے اُن تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا، انھوں نے گاندھی جی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے سیاسی نظریات کو اپنے افسانوں کے ذریعہ عوام تک پہنچایا۔'' (ص ۴۵)

اِس مقالہ میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے پریم چند کا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' میں شامل افسانوں کا متنی تجزیہ کرتے ہوئے جذبہ حب الوطنی کو بڑی خوبصورتی سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

❁❁

مرزا ہادی رسؔوا کے ناولوں میں کردار نگاری

انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب اردو ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس وقت سماجی اور مذہبی اصلاح کے ساتھ Nostlagic موضوعات بھی نالوں میں برتے جانے لگے تھے ڈپٹی نذیر احمد رتن ناتھ سرشؔار اور عبدالحلیم سرشار جیسے معروف ناول نگار مذہب واخلاق اور رشد وہدایت جیسے موضوعات کے ذریعے اردو ناول نگاری کو فروغ دے رہے تھے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تصنیف ''معروضات''میں شامل مقالہ میں مرزا ہادی رسؔوا کے مختلف ناولوں میں کردار نگاری کے حوالے سے بڑی جامع اور مدلل گفتگو کی ہے بلکہ زبان و بیان، مکالمے اور کرداری نگاری پر بحث کرتے ہوئے مرزا ہادی رسؔوا کے کرداروں کو اُس دور کی تہذیب ومعاشرت کا ترجمان بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> مرزا ہادی رسؔوا اردو کے ان معدودے چند ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو ناول کو نفسیاتی کردار نگاری کی نئی اور اہم روایت بخشی رسؔوا کے ناولوں کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے ہوتا ہے، اِس لیے ان کو پیش کرتے وقت حفظ مراتب اور لب ولہجہ کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے ۔رسؔوا کے بیشتر کرداروں کا تعلق لکھنؤ کی سرزمین سے ہے، اسی لیے کرداروں کے لب ولہجہ میں ایک طرح کی رنگینی پائی جاتی ہے ۔محلوں کی

بیگمات ،طوائفیں،شریف گھرانوں کی لڑکیاں ،مہری اور مغلانیاں منتظمین اور ملازمین اپنے اپنے مکالموں میں لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت کو قائم رکھتے ہیں۔''(ص ۴۸)

عبدالحلیم شؔرر کے خیالی قصوں اور ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاح پسند ناولوں کے برخلاف مرزا ہادی رسؔوا نے ''امراؤ جان ادا'' نام سے ایک نیا قصہ پیش کیا تو اُردو ناول نگاری میں کردار نگاری کی نئی جہتوں کا اندازہ ہوا۔مرزا ہادی رسؔوا کا ناول ''امرؤجان ادا'' اپنے اختصار، جامعیت ارتکاز، جاں گداز منظر اور اردو ناول نگاری میں زندگی کی واقعیت اور فن حسن کی وجہ سے طویل عرصہ گزرجانے کے باوجود اپنی تازگی اور فن کاری میں بے مثال ہے بلکہ مرزا ہادی رسؔوا نے ''امراؤجان ادا''میں تخیلی کردار کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کردی ہے۔گوکہ ہادی رسؔوا نے متعدد ناول اور افسانے لکھے لیکن انہیں ناول''امراؤجان ادا'' کی وجہ سے ہی ان کی پہچان مستحکم ہوئی۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ناول''امراؤجان ادا''میں برتی گئی زبان ،لب ولہجہ اس کے بانکپن اور مرکزی کردار امراؤجان ادا کی ذہنی کشمکش پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

رسوا کے اکثر ناولوں کا موقعۂ واردات لکھنؤ ہے جہاں کی فضامیں تیزی اور لطافت ہے۔مرزارسوا کے ناولوں میں امراؤجان اداکو ایک خاص اہمیت حاصل ہے،اِس ناول ایک مہذب طوائف کی آپ بیتی کو بیان کیا گیا ہے جو امراؤجان ادا کی شکل میں سامنے آتی ہے۔امراؤجان ادا کی ذہنی کشمکش اِن الفاظ میں پیش کرتے ہیں:''میرا دل چاہتا ہے کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں نہ کسی کسی پر جان دیں مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔''امراؤجان ادا موضوع اور فن کے اعتبار سے اردو کا ایک اہم ناول ہے اس

کے کردار لکھنؤ کی معاشرت، تہذیب اور ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔''(ص ۴۷)

یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو ناول نگاری کے باب میں ''امراؤ جان ادا'' خاص اہمیت کا حامل ہے اور جو شہرت و مقبولیت مذکورہ ناول کو ملی، وہ مرزا ہادی رسوؔا کے دوسرے ناولوں کو نہیں مل سکی۔ رسوؔا کا ایک اور ناول ''شریف زادہ'' ہے، حالانکہ یہ ناول سوانح عمری کے طرز پر، تصنیف ہوا ہے اور اِس کے مرکزی کردار عابد حسین کی زندگی اور مشکلات کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار عابد حسین پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ضیاءالرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> ''شریف زادہ'' میں مرزا رسوؔا نے مرزا عابد حسین کی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔ اِس ناول میں مرزا عابد حسین کا کردار رسوؔا کا ایک آئیڈیل کردار ہے۔ عابد حسین کی باضابطہ اور بااصول زندگی نے پلاٹ کی تعمیر میں خاص مدد کی۔ ''شریف زادہ'' کے کردار فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں عابد حسین کے کردار میں ارتقا کے آثار پائے جاتے ہیں فدوی میاں، جعفر حسین، فدا حسین، ان کی پھوہڑ بیوی، عابد حسین کی سلیقہ شعار بیوی تقریباً ہر ایک کردار اپنی جگہ ذہن پر تسلط جمالیتا ہے خاص طور پر عابد حسین کی پھوہڑ بیوی ناقابل فراموش ہے اور مرز کے چند کرداروں میں سے ایک ہے جو اپنی انفرادی خوبیوں کی وجہ سے زندہ ہے۔''(ص ۴۸)

دراصل مرزا ہادی رسوؔا کا زمانہ متضاد کیفیات کا زمانہ تھا۔ دو تہذیبی قدریں شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ ملک کی تہذیب و ثقافت نزاعی کیفیت سے دوچار تھی اور مغربی تہذیب اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ روئیدگی کی طرف گامزن تھیں۔ یہ زمانہ سیاسی، تہذیبی، معاشی، سماجی اور ادبی ہر لحاظ سے بحرانی اور انحطاط کا شکار تھا۔ پروفیسر ضیاءالرحمٰن

صدیقی مذکورہ مقالہ میں مرزا ہادی رسؔوا کے دیگر ناولوں ''اختری بیگم'' اور ''ذات شریف'' سے اچھوتے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے اپنا معروضی نقطۂ نظر اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ناول ''اختری بیگم'' میں مرزا رسؔوا نے متوسط اور ادنیٰ طبقہ کے حالات بیان کیے ہیں۔ ''ذات شریف'' کا پلاٹ کافی دلچسپ ہے، زبان و بیان مکالمہ اور کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ایک وقیع ناول ہے۔ اس ناول میں مرزا نے لکھنؤ کے دورِ انحطاط کی زندہ جاوید تصویریں پیش کی ہیں۔ مرزا رسؔوا کے ناولوں میں کردار نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رسؔوا نے اپنے ناولوں میں ایسے کرداروں کو پیش کیا ہے جو کسی ایک تہذیب یا معاشرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رسؔوا کے کرداروں کی وجہ سے ان کے ناولوں میں ایک مخصوص قسم کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔'' (ص ۴۹)

مجموعی طور پر اِس مقالہ میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مرزا ہادی رسؔوا کی ناول نگاری کے تمام فنی لوازمات اور کردار نگاری کے حوالے سے عمدہ گفتگو کرتے ہوئے اُن پہلوؤں، بالخصوص نسائی کرداروں کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے جن میں عورتوں کے معاملاتِ زندگی، مسائل اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور اُن کی پست سماجی حیثیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

❀❀

قومی شعور کی بیداری میں اُردو اخباروں کا حصہ

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا یہ ایک وقیع مقالہ ہے۔اِس نوعیت کے تحقیقی مقالے شاذ و نادر ہی نظر سے گزرتے ہیں کیونکہ یہ ایک دقیق موضوع ہے۔اس قسم کے مضامین کی تیاری میں جس طرح کی محنت شاقہ ،ژرف بینی اور لگن کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ دوسرے محققین میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس مقالہ میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اُن اردو اخبارات کو موضوع بحث بنایا ہے جو خالص سیاسی نظریات کے حامل تھے اور جنھوں نے عوام میں قومی شعور کی بیداری میں نہ صرف اہم کردار ادا کیا بلکہ جنگ آزادی کے فروغ میں پختہ عزم اور ثابت قدم رہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مقالہ کی تمہید میں رقم طراز ہیں:

> ۱۸۵۷ء کے تناظر میں اس عہد کے پرآشوب حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اخبارات نے ہندوستان کے عوام وخواص کو ایک پلیٹ فارم پو لانے اور ملکی شعور کو ایک خاص تحریک کی جانب راجع کرنے میں اہم اہم کردار ادا کیا۔انقلاب ۱۸۵۷ء کا پرآشوب دور ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ میں ایک ایسا حد فاصل ہے جہاں پر ایک عہد کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز یہیں سے ماضی کے نقوش بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے آثار کا بھی

اندازہ لگاجاسکتا ہے۔''(ص۵۱)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندومسلم اور سکھوں نے مل کر نوآبادیاتی حکومت کا سامنا کیا اس بڑھتی قوم پرستی سے خائف ہوکر برطانیہ نے ان مذاہب کے ماننے والوں کو الگ الگ بھڑکانے کی پوری کوشش کی تاکہ ظلم واستبداد پر مبنی حکومت کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنا تحقیقی نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے پنڈت سندرلال کی تحقیقی تصنیف ''سن ستاون'' سے ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں موصوف ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں عوام کے جذبہ آزادی اور قومی یکجہتی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اس ملک میں ہندومسلم اور سکھ اتحاد کی ایک خوبصورت اور چمکدار مثال تھی کیونکہ ہزاروں ہندومسلم اور سکھ رہنماؤں نے اپنے مذہبی اعتقاد پر قائم رہتے ہوئے شہنشاہ ہندوستان کے جھنڈے کے نیچے کندھے سے کندھا ملاکر اپنے پیارے ملک کی آزادی کے لیے جنگ کی۔''

۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کے اعتبار سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے قدیم اور جدید کے درمیان یہی وہ مقام ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ ونسل اور مذہب وملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہوکر ایک طویل زمانے تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی ؛یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہوجاتا ہے،پرانا سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکرونظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل دیتی ہیں۔۱۸۵۷ء میں صرف ایک سیاسی نظام ہی نہیں بدلا بلکہ سارا تہذیبی سرمایہ بھی نیست ونابود ہوجاتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ۱۸۵۷ء کے بدلتے سیاسی نظام کے جائزے میں لارڈ کینگ کی پیش گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت عمدہ اور جامع گفتگو کی ہے:

کینگ کی پیش گوئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی شکل میں رونما ہوئی ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور انگریز ہندوستان پر قابض ہوگئے آزادی کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پورے طور پر برطانوی سامراج کے شکنجے میں آگیا۔نوآبادیاتی حکومت نے معاشی استحصال کے علاوہ برصغیر کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا،مغربی تہذیب کے کے سیلاب میں ہندوستان کی صدیوں سے پرورش یافتہ تہذیبی،سماجی اور اخلاقی قدریں بھی خش و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور پوری ایک صدی قدیم و جدید کی کشمکش میں گزری جس کا انجام مغربی صنعتی تہذیب کے غلبہ و اقتدار کی شکل میں ظاہر ہوا۔انگریزوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے جن تصورات کو فروغ دیا،ان میں قومیت کا شعور بھی تھا جو برصغیر کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔''(ص۵۳)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اِس مقالہ میں صرف انہیں اخباروں کو زیرِ بحث لائیں ہیں جو خالصتاً سیاسی تھے اور جنھوں نے قومی شعور کو مستعد کرنے میں اور جنگ آزادی کے فروغ میں باغیانہ تحریروں کی وساطت سے قلمی جنگ چھیڑی تھی۔اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی نے مختلف ذرائع اور تحقیقی انتقاد کی بنیاد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

اُس دور کے اخباروں میں مولانا محمد باقر کا ''دہلی اردو اخبار'' (۱۸۳۶ء) منشی نول کشور کا ''اودھ اخبار'' (۱۸۵۹ء) جمیل الدین کا ''صادق الاخبار'' بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ''سراج الاخبار'' محمد اکبر کا ''عمدۃ الاخبار'' (۱۸۶۳ء) اسمٰعیل خاں کا ''لارنس گزٹ'' میرٹھ (۱۸۶۴ء) اجودھیا پرشا کا ''خیر خواہ خلق''

اجمیر (۱۸۶۰ء) امراؤ علی کا ''اخبار عالم تاب'' آگرہ (۱۸۶۱ء) ہفتہ وار مکند لال کا ''تاریخ بغاوت ہند'' آگرہ (۱۸۵۹ء) حیدر علی کا ''شعلہ طور'' کانپور (۱۸۶۰ء) محمد منظور کا ''منظور الاخبار'' آگرہ (۱۸۶۰ء) منشی امان علی کا ''کشف الاخبار'' بمبئی (۱۸۶۱ء) ہفتہ وار عبدالرحمٰن سگانے کا ''اخبار صبح'' (۱۸۵۹ء) محمد قاسم کا ''قاسم الاخبار'' بنگلور (۱۸۶۵ء) منشی عبدالحکیم کا ''اخبار عالم'' میرٹھ (۱۸۶۱ء) نصیر الدین آفندی کا ''شمس ''الاخبار'' مدراس (۱۸۵۹) میر فتح اللہ کا ''کوٹہ گزٹ'' صدر راج کوٹہ جنوری (۱۸۶۰ء) منشی دھر کا ''آب حیات'' (۱۸۶۲ء) علاوہ ازیں ''طلسم'' لکھنؤ اِجرا ۱۵ر جولائی (۱۸۵۶ء) ''سحر سامری'' ۱۷ر جولائی (۱۸۵۶ء) ''دبدبہ سکندری'' (۱۸۶۶ء) ''اخبار عالمتاب آگرہ ۱۸۶۱ء وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ متذکرہ اخباروں کا طرز تحریر لب و لہجہ، زبان و بیان براہ راست اور بالواسطہ طور پر انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ تلخ بھی ہوتا تھا اور اخباروں کو قومی شعور کو بیدار کرنے، عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے ارادوں کو مستحکم بنانے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اِس قیامت صغریٰ کے فرد ہونے کے بعد مدیروں پر مظالم توڑے گئے پھانسیاں دی گئیں، مطابع ضبط کر دیے گئے۔'' (ص ۵۵)

انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد جس بہیمیت اور ظلم کے ساتھ ہندوستانیوں کو سزائیں دیں اور ہزاروں بے گناہ ہندوستانیوں کو صرف انتقامی جذبے سے موت کے گھاٹ

اتارا تھا اس کے پس پشت ایک ہی مقصد تھا کہ اِس تحریک کو پوری طرح سے کچل دیا جائے لیکن بالخصوص اُردو اخبارات عوام کے دلوں سے انگریزی خوف و ہراس کے پردے ہٹاتے رہے جس سے تحریک کی نوعیت کا احساس بھی بیدار ہوا اور اِس کے ساتھ ساتھ زاویۂ نگاہ میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔

اِس ضمن میں پروفیسر صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی کے حوالے سے،اس طرح اظہار خیا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ملک گیر سطح پر وقوع پذیر ہونے والی اس تحریک کے دوران لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا،کیننگ نے اُس دور کے اردو اخباروں کے روّیے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا:''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستان باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ بغاوت کے جذبات پیدا کردیے ہیں ۔یہ کام بڑی مستعدی ،چالاکی اور عیاری کیساتھ انجام دیا گیا۔''(ص ۵۵)

''دہلی اردو اخبار''،جس پہلا نام ا''اخبار دہلی'' تھا دہلی سے شائع ہونے والا پہلا ہفتہ وار اُردو اخبار تھا جسے محمد حسین کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا تھا۔اِس اخبار کے ذریعے اُس عہد کی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی اور علمی حالات و کوائف کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس سلسلے میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''دہلی اردو اخبار'' کا نام آخری دنوں میں بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام کی مناسبت کے اعتبار سے''اخبار الظفر'' تجویز کیا تھا۔اس نام سے دہلی اردو اخبار کے صرف دس شمارے دستیاب ہو سکے ہیں۔آخری شمارے میں یہ خبر قابل ذکر ہے ''کئی دن سے لڑائی توپ و تفنگ کی ہو رہی ہے کفار نے کئی

مورچے نئے بنائے ، ادھر بھی مورچے جدید بنے مجملاً اتنا بس
ہے کہ انشاء اللہ صبح وشام تائیدِ ایزدِ قہار، قدرت قادر ذوالجلال
سے صبح اسلام وہلاکت کفار نمایاں ہوئی ہے۔‘‘ (ص ۵۶)

غرض یہ کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو زبان و ادب بالخصوص اردو صحافت نے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے کے لیے اردو ادیبوں، شاعروں اور خاص طور پر اردو صحافیوں نے نہ صرف قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا بلکہ اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حالانکہ اِس سلسلے میں بہت کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا زیرِ نظر مقالہ اس اعتبار سے بہت اہم کہ موصوف نے اِس مقالے کی تیاری میں اُس زمانے کے اردو اخباروں کے تراشے، اداریے اور مضامین کا مطالعہ مختلف لائبریریوں میں خود جا کر کیا، جس سے اس مقالے کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جاتی ہے اور دہلی اردو اخبار کے علاوہ موصوف نے اور بھی کئی اہم اخباروں کے حوالے سے مدلل اور جامع گفتگو کی ہے۔

❁❁

ڈاکٹر خلیق انجم: بحیثیت محقق اور متنی نقاد
آثار الصنادید کے نئے ایڈیشن کی روشنی میں

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''معروضات'' میں اردو دنیا کی معروف شخصیت، ممتاز محقق، ماہر غالبیات اور انجمن ترقی اردو ہند کے جرنل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیقی کاوشوں نیز متنی تنقید کے دیگر تصانیف کا بالتفصیل تذکرہ کرتے ہوئے آثار الصنادید کے نئے ایڈیشن کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> ان کی اِس نوع کی تصانیف میں ''دہلی کے آثار قدیمہ'' اور ''دہلی کی درگاہ شاہ مرداں'' خاص طور پر سامنے آئی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ''دہلی کے آثار قدیمہ'' اور فن تعمیر سے متعلق اردو اکادمی کے ماہنامہ مجلّے ''ایوان اردو'' میں تقریباً تیرہ چودہ قسطوں میں مضامین شائع کرائے تھے۔ مختلف عہد کے فن تعمیر اور آثار قدیمہ پر ان کا مطالعہ بہت عمیق اور وسیع ہے۔ آثار الصنادید کا زیر نظر ایڈیشن جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اوّل میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا

مبسوط اور جامع مقدمہ اور آثار الصنا دید کے متن کا ایک بڑا
حصہ شامل ہے۔انھوں نے اس مقدمہ میں مختلف عہد کی
تعمیرات اور آثار قدیمہ سے تفصیلی بحث کی ہے جو یقیناً ایک
دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔'' (ص ۶۸)

ڈاکٹر خلیق انجم کی پہلی تصنیف ''معراج العاشقین'' سے متعلق تھی اور ان کے Ph.D کے مقالے کا موضوع ''مرزا جان جاناں'' تھا۔اِسی دوران وہ مرزا محمد رفیع سوداؔ پر بھی مواد جمع کر رہے تھے اور مرزا محمد رفیع سوداؔ پر ان کی کتاب انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی تھی۔اِس حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

بنیادی طور پر تو ڈاکٹر خلیق انجم محقق اور متنی نقاد ہیں، تحقیق میں ان
کا پہلا اہم کام مرزا محمد رفیع سوداؔ ہے۔آٹھ سو صفحات پر مشتمل
یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۶۵ء میں شائع کی تھی۔اس
وقت تک انجمن نے پچھلے ساٹھ پینسٹھ برسوں میں جن ادیبوں
اور محققوں کی کتابیں شائع کی تھیں، ان میں سب سے کم عمر
ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔انجمن کے سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور
نے اِس علمی اور تحقیقی شاہکار کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''جو
لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق وتنقید کا معیار گر رہا ہے، انہیں
خلیق انجم کی اس قابل قدر تصنیف کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔''
(ص ۶۳)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی سر سید احمد خاں کی معروف تصنیف ''آثار الصنا دید'' کے نئے ایڈیشن کے ضمن میں ڈاکٹر خلیق انجم کی کاوشوں، متنی تنقید کے طریقۂ کار اور جدید اصولوں کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ڈاکٹر خلیق انجم نے ''آثار الصنا دید'' کو پہلی بار متنی تنقید کے

طریقۂ کار اور جدید اصولوں کے تحت ترتیب دیا ہے۔اس سے قبل آثارالصنادید پر اس نوع کا کام سامنے نہیں آیا، یہ کام ایک پروجیکٹ کے طور پر شروع کیا جاتا اور اس پروجیکٹ میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ماہرین بھی شامل ہوتے لیکن اِس مرد مجاہد نے گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں تنہا آثارقدیمہ کو تلاش کر کے اپنے کیمرے سے فوٹو گراف فراہم کیں جو اِس ایڈیشن کے دوسرے اور تیسرے حصے میں شامل ہیں۔اِس طرح کا کام تحقیق اور آثار قدیمہ میں غیر معمولی دلچسپی رکھنے والا شخص ہی سرانجام دے سکتا ہے۔اس ایڈیشن میں ڈاکٹر خلیق انجم نے دہلی کے مختلف آثارقدیمہ کی وضاحتی کتابیات بھی تیار کی ہے اور ایک آثار پر تقریباً سوسو مآخذ تلاش کر کے انہیں کتاب میں شامل کیا ہے اور حواشی میں ان سے متعلق اردو فارسی اور انگریزی ماخذوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔''(ص۷۰)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ڈاکٹر خلیق انجم کے جلد اوّل میں شامل مقدمہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ایڈیشن کے مطالعے کے بعد نہ صرف آثارالصنادید کا مطالعہ مکمل ہوجاتا ہے بلکہ آثارالصنادید کے بعد یا اس سے پہلے فن تعمیر پر لکھی گئی کتابوں کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہوجاتی ہے۔جب کسی متن کی تدوین، اس کی تالیف کے کچھ عرصے بعد عمل میں آتی ہے تو ایسی صورت میں متنی نقاد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، جس نے ان کی تدوین کا بیڑا اٹھایا ہے۔''پروفیسر صدیقی مزید لکھتے ہیں:

سرسید نے دہلی کی آثارقدیمہ اور تہذیب و ثقافت کے بیان میں جن مآخذ کی مدد لی تھی، آج کے زمانے میں ان کی توثیق

کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ مرتب ایسے ماخذوں کی
نشاندہی بھی کرے جس پر اصل مصنف کی نگاہ نہ گئی ہو اور
آثارالصنادید کی ترتیب میں ایسا ہی ہوا ہے جس کی وجہ سے اس
کا وقار قائم ہوتا ہے۔'' (ص۷۰)

پروفیسر صدیقی ،ڈاکٹر خلیق انجم کی علمی کاوشوں کو سراہتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ '' آثارالصنادید' وہی شخص مرتب کرسکتا ہے جو ادیب ہو،متنی نقاد ہو اور اس فن کے جدید اصولوں سے واقف ہو فن تعمیر سے گہری دلچسپی رکھتا ہو اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ سے بخوبی واقف ہو ، یہ تمام صلاحیتیں ڈاکٹر خلیق انجم میں موجود ہیں ۔اس لیے انھوں نے آثارالصنادید اس انداز میں مرتب کی ہے کہ اس کو تاریخی و متنی تنقید کا قابل تقلید نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

❀❀

شہبازؔ امروہوی: قابل توجہ طنز نگار

سرزمین امروہہ نے ہر دور میں ادیب ،فلسفی اور میدان شاعری میں بڑے قادر کلام ومایہ ناز شاعر پیدا کیے ہیں۔ یہ مردم خیز علاقہ صوفیا،شعرا،ادبا اور ہمیشہ کاملین علم و دانش کا مرکز رہا ہے۔امروہہ کی فضا روحانیت ،تصوف،علم وادب اور شعروسخن کی روشنی سے ہمیشہ معمور رہی ہے امرہہ کے اہل علم وشیوخ نے مختلف جہتوں سے اردو زبان وادب کی نا قابل فراموش خدمت انجام دیں اور اس شہر کو رئیس امروہوی، جون ایلیا اور کمال امروہوی جیسے معروف شاعروں کی بھی نسبت حاصل ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا مذکورہ بالا مقالہ اسی شہر سے تعلق رکھنے والے طنز وظرافت نگار شاعر شہبازؔ امروہوی کی پیدائش ،شخصیت و پرداخت ،ان کی زندگی کے حالات وکوائف اور شاعرانہ عظمت کا احاطہ کرتا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> سلطان احمد صدیقی شہباز امروہوی ۲۳/جنوری ۱۹۱۰ء کو امروہہ ضلع مرادآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے ،رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی ،عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں منشی سجاد حسین سے پڑھیں اور اکتسابی علم وفن امروہہ کے ایک معروف شاعر حضرت افقؔ کاظمی سے کیا ،منشی کامل اور دیگر امتحانات پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیے اور

۱۹۲۸ء میں میٹرک کی سند حاصل کی۔''(ص ۷۳)

طنزیہ و مزاحیہ شاعری اکبرالہ آبادی سے پہلے جعفرزٹلی اور مرزا محمد رفیع سودؔا کے یہاں اِس نوع کی شاعری کے ابتدائی نمونے نظر آتے ہیں جن میں سیاسی و سماجی بصیرت کے احساس کے ساتھ معاشرے اور افراد کی کج روی اور خامیوں پر طنز و مزاح کے وار کسی حد تک واضح ہیں ۔ پروفیسر صدیقی نے شہبازؔ امروہوی کے طنزیہ و مزاحیہ کلام میں انہیں احساسات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے:

> شہبازؔ کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے، انھوں نے سماج کے ادبی ،لسانی اور معاشرتی پہلوؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور کاری ضربیں لگائی ہیں لیکن ان کے یہاں طنز و مزاح کے پس پشت اصلاح کے پہلو نظر آتے ہیں۔شہبازؔ امروہوی بنیادی طور پر طنز نگار تھے لیکن شگفتگی اور تازگی کے ساتھ ان کے مزاح میں ایک خاص قوت ہے جو زندگی پر گہرے اعتماد کی کیفیت کو قاری کے دل کی گہرائیوں میں اتار دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے فن میں کاغذ کی کشتیاں نہیں چلائیں بلکہ زندگی کے بھنور میں ڈوبتے ہوؤں کو سعی پیہم کا حوصلہ دیا ہے ۔وہ اوچھا وار نہیں کرتے ،ان کے طنز کی کاٹ بہت کاری ہے لیکن ان کا تاثر مثبت ہے ۔شہبازؔ امروہوی ایک سریع الفہم اور ذکی الحس انسان تھے،الفاظ پر انہیں استادانہ قدرت حاصل تھی، فن عروض سے بخوبی واقف تھے۔''(ص ۷۵)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے شہبازؔ امروہوی کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریر کا ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

شہبازؔ کے کلام میں ایسی تازگی اور شگفتگی ہے جیسے نور ظہور کے

وقت کھلے ہوئے گلاب میں ہوتی ہے۔میں ان کے کلام کو پوری توجہ اور تفصیل سے دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس دور کے بڑے مزح نگار ہیں ۔ان کی شاعری کا دائرہ محدود نہیں ہے ۔انھوں نے کم و بیش ان تمام معاشرتی ،مذہبی،تہذیبی اور سیاسی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جس سے برصغیر کا معاشرہ دوچار ہے شہبازؔ امروہوی نے زندگی کو مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنی ظریفانہ شاعری میں اسے شگفتگی اور مہارت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔انہیں زبان و بیان پر استادانہ قدرت حاصل ہے۔''(ص۷۴)

شہبازؔ امروہوی نے زبان و بیان اور دیگر لوازم شعری کے علاوہ صنعتوں کے استعمال سے بھی اپنی شاعری کو وسعت دی بلکہ اپنے طنزیہ ومزاحیہ کلام کو خوبصورت بھی بنایا نیز وہ قافیوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور ان کے ذریعے لفظ و معنی کی ایک ایسی فضا تیار کرتے ہیں جو بعد میں آنے والے شعرا کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتی ہے ۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے شہبازؔ امروہوی کے کلام سے صنعتوں کی جستجو میں لکھا ہے:

شہبازؔ کے کلام میں صنعتوں کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے مثلاً تضاد و مطابقت،توریہ وایہام،مراۃ النظیر ،تشابہہ الاطراف، حسن تعلیل، تجاہل عارفانہ مشاکلت، مزاوجت، ارتضاد، استخرام،رجوع،جمع تفریق تقسیم تجرید،مبالغہ، مذہب الکلافی، مذہب الفقہی ،تاکید المز اح،بمایشہ الذام اطراد تجنیس خطی، حشو ملیح،تغیر،تلمیح، برات استہلال، اِدعا،تجنیس تام، استخذ ام ترصیع ،رقطا،فوق الفقاط وغیرہ۔''(ص۷۹)

شہبازؔ امروہوی اپنی جدت ادا ،موضوعات کے تنوع ،زبان و بیان پر قدرت اور

موضوعات کی یکسانیت کی وجہ سے بجا طور پر اکبرؔ الہ آبادی کے قریب نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری کا تانا بانا اکبرؔ کے فکر و خیال اور فن سے بنا ہے۔شہبازؔ کے یہاں تمام تیر و نشتر بہ حسن خوبی موجود ہیں اور تضمین نگاری میں بھی وہ اکبرؔ کے جاں نشیں قرار دیے جاسکتے ہیں۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے شہبازؔ امروہوی کے کلام سے ضمینی کلام کے نمونے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اردو میں فن تضمین کی روایت بھی خاصی پرانی ہے ۔بیشتر شعرا نے اساتذہ کے کلام پر تضمین کی ہیں لیکن اردو میں اس فن پر کوئی مستقل کتاب نہیں ملتی ،اس فن پر توجہ کی ضرورت ہے۔شہبازؔ امروہوی اس فن سے محروم نہیں تھے انھوں نے اردو کے بعض اہم اساتذہ کے کلام پر تضمینیں کی ہیں اور اس فن کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔''(ص ۷۷)

اردو شعرا نے مشہور و معروف کلام کی پیروڈی میں نئے نئے تجربے کیے اور اکبرؔ الہ آبادی کے لگائے ہوئے پودے کو ایک سرسبز و شاداب تناور درخت بنا دیا،بعد کے اردو شعرا نے پیروڈی کو مضحک صنف سخن اپنایا اور اسی سیاسی و سماجی ابتری پر طنز کرنے کے لیے اِس صنف کا انتخاب کیا،ساتھ ہی لفظی پیروڈی کے ذریعے طنز و مزاح کے دامن کو بھی وسیع کیا۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے شہبازؔ امروہوی کی پیروڈی کے چند مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ''شہبازؔ امروہوی اردو کے ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر تھے انھوں نے جہاں شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی وہاں صنف پیروڈی میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔''

❀❀

رؤف امروہوی: بحیثیت نعت گو

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تصنیف ''معروضات'' میں شامل ایک جامع اور دلچسپ مقالہ جو گہوارۂ علم و ادب امروہہ کے ہی مشہور و معروف نعت گو شاعر رؤف امروہوی کی شخصیت کے حوالے سے ہے اس مقالہ میں موصوف نے رؤف امروہوی کے حالات زندگی اور ان کی نعت گوئی پر روشنی ڈالتے ہوئے صنف نعت گوئی اور اس کی تاریخ کے حوالے سے مدلل و جامع گفتگو کی ہے نیز نعت گو شعرا کی ایک طویل فہرست کو بھی مقالہ کا حصہ بنایا ہے۔

تمام شعری اصناف میں صرف صنف نعت ہی وہ مہتمم بالشان موضوع ہے جس میں فاقیت کے وسیع جلوے دکھائی دیتے ہیں ۔اِس پاکیزہ اور مقدس موضوع پر تحقیقی اور علمی انداز سے جو کام سامنے آرہے ہیں ،وہ قابل صد ستائش ہیں ۔یہ رفعت اور اعزاز کسی دوسری صنف سخن کو حاصل نہیں ہے صنف نعت کی آفاقیت اور قدامت اظہر من الشمس ہے۔یہ دوسرے موضوعات کی طرح محدود اور مخصوص فکر کی حامل نہیں اِس کی ہمہ گیری اور وسعت کا عالم دیدنی اور فکر و خیال سے ماورا ہے۔

نعت گوئی اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> ''نعت'' عربی کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی ثنا، تعریف اور مدح کے ہیں جو بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہی تخلیق کی جاتی ہے اور صرف انہیں کے اوصاف بیان کیے

جاتے ہیں ۔اس طرح یہ پورا تخلیقی نظام نعت گوئی کہلاتا ہے۔بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جب قطب شاہی دور کا آغاز ہوا تو اُس دور میں متعدد نعتیہ مثنویاں لکھی گئیں،اس دور کے شعرا میں محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں ۔اُس دور کے ایک شاعر سید بلاقی نے ایک نعتیہ مثنوی ''معراج نامہ'' کے نام سے تخلیق کی تھی،یہ مثنوی پندرہ سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے،اس کے بعد عادل شاہی دور کے ایک شاعر مختار کی نعتیہ مثنوی ''معراج نامہ'' کے نام سے ملتی ہے ۔محمد عادل شاہ کے عہد میں مولانا نصرتی نے بھی ''معراج نامہ'' کے نام سے ایک سو اکتیس اشعار پر مشتمل ایک مثنوی اثنائے رسول صلعم بھی لکھی تھی۔''

(ص۹۰)

نعت گوئی فن شاعری کے زیور کا نگینہ ہے ۔نعت گوئی کا فن بہ ظاہر جس قدر آسان نظر آتا ہے بباطن اسی قدر مشکل ہے۔ایک طرف وہ ذات گرامی ہے جس کی مدح خود رب العالمین نے کی ہے،دوسری طرف زبان اور شاعری کے جمالیاتی تقاضے ہیں،اس لیے نعت کا حق وہی ادا کرسکتا ہے جو جذبۂ عشق رسولؐ سے سرشار ہو اور یہ وصف وہبی ہے کہ بس جسے اللہ توفیق دے،وہی نعت کہہ سکتا ہے۔اِس خیال کو غالبؔ نے اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

اردو شاعری میں نظم کی اصناف سخن میں نعت وہ وصف ہے جس کے اشعار میں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہے۔اردو کی شاید ہی ایسی کوئی صنف ہو جس میں نعتیں نہ کہی گئی ہوں،اس کے لیے اس کے اسالیب طے شدہ نہیں ہیں،اس طرح سے اس کا دائرہ بھی

بہت وسیع ہو جاتا ہے، لیکن سب سے اہم تقاضا عشق رسولؐ سے سرشاری ہی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی رؤفؔ امروہوی کی نعت گوئی اور ان کے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> رؤفؔ امروہوی سچّے عاشق رسولؐ تھے، ہر جمعہ کو ان کے مکان پر نعت خوانی کی محفل ہوتی تھی، یہ سلسلہ گذشتہ ۶۵ سال تک جاری رہا۔ رؤفؔ امروہوی نے نعت گوئی کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، وہ تمام عمر نعت لکھتے رہے اور پڑھتے رہے اور عشق نبیؐ میں غرق رہے رحلت سے قبل وہ عالم استغراق میں تھے انھوں نے تخمسیاں بھی لکھے اور قطعات بھی رؤفؔ امروہوی نے نعت گوئی کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس صنف ارتقائی منزلوں تک پہنچانے میں بھی مدد کی۔" (ص۸۹تا۹۵)

مقالہ کے آخر میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے رؤفؔ امروہوی کو بذلہ سنج بتاتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ "رؤفؔ امروہوی صوفی منش اور قلندر انسان تھے۔ وہ بڑے سخی اور متدین انسان تھے۔ انہیں زندگی میں رسول صلعم کے روضۂ اقدس کی زیارت کی خواہش پوری ہوئی۔ سنہ ستّر میں وہ حج اکبری کے لیے تشریف لے گئے۔" رؤفؔ امروہوی کا ایک نعتیہ شعر جو انھوں نے اُس موقع پر کہا تھا۔

سنہ ستّر میں مدینہ مجھ کو بلوایا گیا
اس طریقے سے کہ دنیا آج تک حیران ہے

❁❁

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اُردو طنز ومزاح کا کردار

طنز ومزاح کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادب میں اس کی عمر زیادہ عرصہ کو محیط نہیں ہے، گو کہ اردو ادب کی عمر بھی زیادہ لمبی نہیں ہے لیکن اس کی مقدار اور اس کے معیار کو تنقید کی کڑی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ اس پر پورا اُترتا ہے اور طنز وظرافت کے جتنے بھی روپ ممکن ہیں، وہ سب خواہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، اردو کے نثری ادب میں ضرور مل جاتے ہیں۔ جہاں تک اردو کے نثری ادب میں طنز ومزاح کا تعلق ہے تو اس کے دھندلے نقوش اردو کی ابتدائی داستانوں سے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں جس داستان کی طرف سب سے پہلے ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے، وہ میر امن کی ''باغ و بہار'' ہے لیکن چونکہ قصے کی سنجیدگی فضا پر غالب آگئی ہے لہٰذا ظرافت کے نقوش دب کر رہ گئے ہیں۔

اِس سلسلے کی دوسری داستان لکھنوی طرز کی ''فسانہ عجائب'' ہے۔ اس دور کی بعض داستانوں مثلاً حیدر بخش حیدری کی ''طوطا کہانی'' اور حاتم کی ''الف لیلیٰ'' کے اُردو تراجم میں مزاح کے ہلکے نقوش ضرور ملتے ہیں لیکن ان کا رنگ زیادہ شوخ نہیں ہے۔

بہر کیف پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ''تحریک آزادی میں اردو طنز ومزاح کا کردار'' پر ''معروضات'' میں ایک مقالہ شامل کیا ہے لیکن اِسی موضوع پر موصوف کی دوسری شاہکار

تصنیف ''تحریک آزادی اور اردو نثر'' میں باقاعدہ ایک باب موجود ہے جس میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس موضوع پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ مذکورہ باب میں تحریک آزادی کے زیرِ اثر طنزیہ و مزاحیہ سپردِ قلم کیے گئے مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں طنز و مزاح کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ،اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کیا حالات تھے جس کے نتیجے میں ایسے مضامین وجود میں آئے۔

''تحریک آزادی اور اردو نثر'' کے باب ششم میں منشی سجاد حسین کے مضامین جن میں ''انڈے بچّے والی چیل چہاڑ''، نیچر کا مارشل ،خلق میں مہرووفا'' وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ پنڈت جوالا پرشاد برق ،رشید احمد صدیقی کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین پر اظہار خیال کیا ہے۔اس کے علاوہ پروفیسر صدیقی نے ''اخبار الپنچ'' کے مضامین پر بھی مدلل اور جامع تبصرہ کیا ہے نیز ''اودھ پنچ'' کے بعد طنز و مازح کے عبوری دور کے اردو مزاح نگاروں میں مہدی آفادی،محفوظ علی،نیاز فتح پوری،سجاد حیدر یلدرم،سلطان حیدر جوش ،ابوالکلام آزاد،محمد علی جوہر ،قاضی عبدالغفار،سجاد انصاری،ملا رموزی وغیرہ کے مضامین پر تبصروں کے بعد جدید دور کے مزاح نگاروں فرحت اللہ بیگ ،عظمت اللہ خاں ظفر علی خاں ،عبدالمجید سالک ،چراغ حسن حسرت،امتیاز علی تاج عبدالعزیز۔فلک پیما،کنہیالال کپور،احمد شاہ بخاری،عظیم بیگ چغتائی،کرشن چندر،شوکت تھانوی احمد شاہ بخاری،حاجی لق لق وغیرہ کی تخلیقات پر جامع تبصرہ کیا ہے۔

واضح رہے کہ قارئین اور طلبہ اِس مقالہ کا مکمل و مفصل تجزیہ کا مطالعہ کرنے کے لیے پروفیسر صدیقی کی تصنیف ''تحریک آزادی اور اردو نثر'' کے دیگر تجزیوں میں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

❀❀

خواجہ غلام السیدین
سرزمین ہریانہ کا ماہر تعلیم

پروفیسر ضیاء الرحمٰن کی مختلف تصنیفات اور ملک و بیرون ملک کے معیاری رسائل و جرائد میں مطبوعہ مقالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موصوف نے اکثر ایسی نابغہ شخصیات پر مقالات سپرد قلم کیے ہیں جنھوں نے ملک وقوم کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا اور قوم کی خدمت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ''معروضات'' کا آخری مقالہ شمالی ہندوستان کا صوبہ ہریانہ کے ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کی شخصیت، اُن کے علمی اور تعلیمی کارناموں سے متعلق ہے جو موصوف کی اِسی قسم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

یہ بات احتمال سے خالی ہے کہ خانوادۂ حالؔی کو کئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کہ اِس میں خواجہ الطاف حسین حالؔی علوم وفنون اور ادب کے مہر درخشاں تھے اور دیگر افراد خانہ جن میں خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام السبطین، خواجہ احمد عباس، خواجہ غلام الثقلین، مشتاق فاطمہ، اخلاق حسین، صالحہ عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ایسے تابندہ ستارے ہیں جنھوں نے فن شاعری، صحافت، خاکہ نگاری سوانح نگاری، فلم سازی اور علم وادب اور فنون کو وہ روشنی عطا کی جس کی شعاؤں سے اردو ادب آج بھی منور نظر آتا ہے۔

خواجہ غلام السیدین بھی انہیں تابندوں ستاروں، نابغہ روزگار اور عبقری وفطین شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے علم وادب، خطابت، سوانح نگاری، خاکہ نویسی، تنقید نگاری، لسانیات اور تعلیم کے میدان میں اہم کارہائے نمایاں انجام دیے جس سے وہ نہ صرف خاندان حالؔی کی علمی وجاہت اور تعلیمی اقدار کے مبلغ کے طور پر پہچانے گئے بلکہ ملک وملت کا بھی نام روشن کیا اور چاردانگ عالم میں اپنے زریں کارناموں سے مشہور ومعروف ہوئے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی صوبہ ہریانہ اور اِس خطے کی علمی وادبی فضا نیز یہاں کے نابغہ شخصیات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ہندوستان کی ریاستوں میں ہریانہ ایک ایسا مردم خیز اور زرخیز خطہ ہے جہاں بے شمار ادیب، شاعر، فن کار، سیاست داں اور صوفیہ جنم لیتے رہے ہیں، اسی سرزمین ذہانت آفریں سے وحید الدین پانی پتی، مشہور صوفی بزرگ بوعلی شاہ قلندر، خواجہ الطاف حسین حالی، خواجہ احمد عباس، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام الحسنین اور خواجہ غلام السبطین ایسی نادر و نایاب شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے علم کی روشنی سے دنیائے ادب کو منور کیا، اِسی سرزمین بے مثال پر خواجہ غلام السیدین ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۰۴ء کو پانی پت میں جنم لیا، ان کی والدہ مشتاق بیگم ایک ذہین اور صالح خاتون تھیں۔ والدین کی تربیت نے سیدین صاحب کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے غلام السیدین بیک وقت ماہر تعلیم، شعلہ نوا خطیب اور اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ خانوادۂ حالی کے اِس ذہین فرزند نے اپنے خاندان کی علمی وجاہت اور تعلیمی اقدار کو آگے بڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔'' (ص ۱۲۰)

اِس سیاق میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے غلام السیدین کی خودنوشت سے چند سطور نقل کی ہیں جس میں موصوف (خواجہ غلام السیدین) لکھتے ہیں:

''سب سے اہم چیز جس کے لیے میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں، یہ ہے کہ اس نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر میں خود انتخاب نہیں کر سکتا، یہ بات فخر کے ساتھ نہیں بلکہ انکسار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ نعمت مجھے بغیر کسی استحقاق کے ملی۔'' (ص۱۲۰)

جہاں تک خوجہ غلام السیدین کی علمی و ادبی فتوحات کا تعلق ہے، وہ بیک وقت شعلہ نوا خطیب ماہر تعلیم اور قلم کار تھے۔ اپنی ذہانت اور علمی قابلیت کی وجہ سے وظیفہ پا کر انگلینڈ تشریف لے گئے اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مفصل گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میٹرک کا امتحان حالی مسلم ہائی اسکول سے پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور وہاں سے بی اے فرسٹ پوزیشن میں مکمل کیا ٹینس Tennis سے انہیں گہری دلچسپی تھی اور خطابت سے بھی انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ وہ اسکول اور کالج سطح پت بھی تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنے اجداد کی طرح انھوں نے وہاں کی علمی و ادبی زندگی میں نمایاں حصہ لیا۔ سیدین صاحب لیڈز یونیورسٹی میں جانے کے لیے انگلستان روانہ ہوگئے، ڈپلومہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سیدین صاحب نے اِسی یونیورسٹی سے ماسٹر آف ایجوکیشن M.Ed کی ڈگری حاصل کی۔'' (ص۱۲۰ تا ۱۲۱)

خواجہ غلام السیدن اپنی مادر درس گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بے حد ذہنی وابستگی و قلبی لگاؤ کے سبب علی گڑھ واپس آ گئے، جس کی تکمیل کے ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

جب راس مسعود صاحب نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو
انھوں نے ٹریننگ کالج کے لیے لیڈز یونیورسٹی یا لندن
یونیورسٹی سے کسی ماہر تعلیم کو بلانے کی خواہش ظاہر کی ، غالبًا
انہیں سیدین صاحب کی صلاحیتوں کا علم نہیں تھا۔ لیڈز
یونیورسٹی سے جواب ملا ،آپ کے یہاں سیدین صاحب جیسے
ماہر تعلیم موجود ہیں ،آپ ان کی خدمات حاصل کیوں نہیں
کرتے ۱۹۳۱ء میں سیدین صاحب کا تقرر پروفیسر کی حیثیت
سے ہوگیا اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریک میں اِسی طرح دلچسپی لیتے
رہے۔'' (ص ۱۲۲)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ،خواجہ غلام السیدین اپنی علمی ،انتظامی صلاحیتوں اور ذہانت وفطانت کے سبب ٹریننگ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پرنسپل کے عہدے پر مامور رہے۔ بعد ازاں بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دیں ،اس حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۹۳۸ء میں سیدین صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کی خواہش
پر ریاست جموں کشمیر کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور سات سال
کے دوران انھوں نے جموں کشمیر کے نظام تعلیم کو فروغ دینے
میں میں بڑا اہم کردار ادا کیا، ۱۹۴۵ میں نواب رام پور کی
خواہش پر ریاست رام پور میں مشیر تعلیم کا عہدہ
سنبھالا اور دو سال کے عرصہ میں انھوں نے رام پور اسٹیٹ
کے تعلیمی معیار کو بلند کیا اور بعض نئ پالیسیاں وضع
کیں۔ ۱۹۴۷ء میں خواجہ غلام السیدین کو بمبئ کے وزیر اعلیٰ
نے گورنمنٹ آف بمبئ کے تعلیمی مشیر کی حیثیت سے خدمات
حاصل کرنا چاہیں۔ سیدین صاحب تین سال تک بحیثیت مشیر

کام کرتے رہے، بمبئی میں تین سال مکمل کر لینے کے بعد مولانا آزاد کی ایما پر محکمہ تعلیم میں جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے اس کے بعد محکمۂ تعلیم ہی میں ایڈوائزر کے عہدے پر مامور ہوئے ۔خواجہ غلام السیدین بارہ سال تک محکمۂ تعلیم میں مولانا آزاد کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔(ص۱۲۲)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ،خواجہ غلام السیدین کی علمی اور عملی خدمات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جب سیدین صاحب ایجوکیشن منسٹری سے ریٹائرڈ ہوئے تو گورنمنٹ نے انہیں ایک بار پھر کشمیر میں ایجوکیشن ایڈوائزر مقرر کیا۔خواجہ غلام السیدین تعلیم کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔انہیں بیرون ممالک کی یونیورسٹیوں میں انہیں بڑی مقبولیت حاصل تھی انھوں نے ساک فیلو فاؤنڈیشن کی دعوت پر امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں توسیع لیکچر دیے۔''

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تحقیق کے مطابق خواجہ غلام السیدین نے عالمی مشن برائے عراق میں ایجوکیشن ایڈوائزر کی حیثیت سے کام کیا۔آسٹریلیا کے لیے نیوایجوکیشن فیلوشپ کے بین الاقوامی وفد کے ممبر رہے۔لندن یونیورسٹی کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں لیکچر دیے۔خواجہ غلام السیدین کی مجموعی خدمات کے پیش نظر حکومت ہند نے انہیں پدم بھوشن کے خطاب سے بھی نوازہ نیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔

❀❀

شہیدانِ جنگ آزادی: تاریخی تجزیہ

حالانکہ شعبۂ ''تاریخ'' عام طور مورّخین کا موضوع رہا ہے، چند ادیبوں نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو ادب اُن کا محبوب ترین موضوع ہے۔اُردو کی سبھی معروف اصناف جن سے انھوں نے جنگ آزادی سے متعلق مختلف پہلو اور گوشے تلاش نہ کر لیے ہوں۔غزل،نظم،افسانہ،ناول،طنز ومزاح،اردو ڈرامے،صحافت،خودنوشتیں،حتیٰ کہ سوانح عمریوں میں بھی جنگ آزادی کے نشانات ڈھونڈ لیے۔

مذکورہ بالا وہ اصناف ادب جن میں مختلف ادیبوں،شاعروں اور محققین نے جنگ آزادی سے متاثر ہوکر، براہ راست یا بالواسطہ ادب تخلیق کیا جسے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے محنت شاقہ، ژرف بینی اور تلاش وجستجو سے اِس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں اور اُن کتابوں کی اہمیت وافادیت کی وجہ سے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس موضوع پر متعدد مضامین بھی تحریر کیے ہیں جو ملک وبیرون کے مختلف ادبی ومعیاری رسائل میں شائع ہوکر نہ صرف داد تحسین حاصل کر چکے ہیں بلکہ اس موضوع پر طلبہ اور محققین کی ضرورت میں بھی معاون ثابت ہوئے ہیں۔اگر چہ یہ کتاب جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کے کارناموں کا احاطہ کرتی ہے لیکن اس کتاب میں اُن مجاہدین آزادی کے کارناموں کو بطور خاص منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی جو غیر معروف (Unsung) ہیں یا

جن کو مورّخین نے عام طور پر نظر انداز کیا ہے اُن ایسے مجاہدین کے نام بھی شامل ہیں جنھوں نے تحصیلوں، قصبوں اور چھوٹے چھوٹے دیہی علاقوں میں رہ کر آزادی کی جنگ لڑی، انگریزوں سے معرکہ لیا اور اپنے وطن عزیز کی آزادی کی خاطر اپنی جان تک قربان کردی۔ دوسو اٹھارہ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب ''شہیدان جنگ آزادی'' موصوف کی دیگر تحقیقی و تنقیدی کتابوں کی طرح ایک بہترین اور قابل ستائش تحقیقی کارنامہ ہے، جسے موصوف نے ژرفائے دل تلاش و جستجو اور بڑی دانش مندی سے تیار کیا ہے۔

اس حوالے سے یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مذکورہ کتاب چھتیس گڑھ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر رمن سنگھ اور وزیر برائے اقلیتی امور کیدار ناتھ کشیپ کی ایما اور خواہش پر شائع ہو کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں چھتیس گڑھ اردو اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری، پروفیسر صدیقی کی غیر معمولی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> برسوں سے عوام و خواص میں اس نوع کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ موصوف نے یہ کتاب ترتیب دے کر تاریخ کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ''شہیدان جنگ آزادی'' کے موضوع پر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو یقیناً اس موضوع سے متعلق تحقیق کرنے والے طلبہ کے لیے معاون ثابت ہوگی۔'' (ص ۲۱ تا ۲۲)

کتاب کی ترتیب و تیاری اور تلاش و جستجو سے متعلق پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> اِس موضوع سے متعلق منتشر مواد فراہم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ مجاہدین آزادی کے بارے میں مواد کی فراہمی میں جس قدر دقتیں پیش آئیں، اُن کا اندازہ لگانا مشکل

ہے،اس سلسلہ میں ترقی اردو بیورو کی کتاب ''شہیدان آزادی'' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔اخبارات ورسائل کے علاوہ علاقائی سطح پر بعض برگزیدہ اور معتبر شخصیتوں سے بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں،مختلف ذرائع سے حتی الوسع جتنے بھی مسلم مجاہدین آزادی کے بارے میں معلومات فراہم ہوسکی ہیں انہیں اِس کتاب میں پیش کردیا گیا ہے۔کوشش کے باوجود گمان غالب ہے کہ بہت سے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔''(ص۱۹)

ٹیپو سلطان کی قربانیوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے کہ جس نے جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلی مرتبہ اعلان کیا تھا کہ''ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لیے ہے''اور اپنے اس اعلان کی لاج رکھتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا لیکن اپنے جیتے جی سامراجی قوت کے قدم ہندوستان کی سرزمین پر مضبوط نہ ہونے دیے۔اِس سیاق میں پروفیسر صدیقی اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

ٹیپو سلطان کو اپنے وطن سے کی سرزمین سے بے پایاں محبت اور عقیدت تھی،وہ سچا محبّ وطن تھا اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینا چاہتا تھا۔ٹیپو سلطان اُس دور کا واحد حکمراں تھا جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ''ہندوستان صرف ہندوستانیوں کا ہے۔''(ص۱۷)

ہندوستانی مسلمانوں کی وطن پرستی اور حب الوطنی کا سب سے زیادہ مکمل اور بھرپور مظاہرہ ۱۸۵۷ء کی بے سود جنگ آزادی میں ہوا جس میں ہندوستانی مسلمانوں نے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوکر غیر ملکی طاقت سے لوہا لیا تھا۔اس جنگ میں مسلمانوں کا جاہ واقتدار،عزت و آبرو،جان و مال سب کچھ قربان ہوگیا تھا۔انگریزوں سے لڑتے ہوئے ہزاروں مسلمان شہید

ہو گئے ہزاروں انگریزوں کے سفا کانہ انتقام کی بھینٹ چڑھ گئے، لاکھوں بے گھر ہوئے مقتدر و متمول اور اشراف ذلیل و خوار ہوئے۔

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے خلیق احمد نظامی کی تصنیف سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جسے یہاں لکھنا ناگزیر ہے:

> ''ہزاروں مسلمان معمولی معمولی شبہات پر تہہ تیغ کر دیے گئے ہزاروں مسلمان گھرانے نان شبینہ کو محتاج ہو گئے اور سیکڑوں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم میں دردر مارے پھرنے لگے۔'' (ص ۱۸)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ کی کتاب ''ہندوستان میں اکتالیس سال'' کا دلدوز اقتباس بھی نقل کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ''۱۸۵۷ء کے غدر میں ستائس ہزار باغی مسلمانوں کو پھانسی دی گئی اور قتل عام میں جو مسلمان مارے گئے، اُن کا کوئی شمار نہیں۔''

جب انڈین نیشنل کانگریس کے تحت آزادی کی باضابطہ تحریک شروع ہوئی تو اس میں مسلمان پورے جوش وولولے کے ساتھ شریک ہوئے اور اپنے ہم وطنوں کے شانہ بہ شانہ انھوں نے بے مثال کارنامے انجام دیے، ایک آواز ہو کر ملک کی آزادی کا سلوگن بلند کیا، انگریزوں کی لاٹھیاں کھائیں گولیوں کا نشانے بنے، جیلوں کو آباد کیا، ملک بدر ہوئے۔ اِن حریت پسندوں میں عوام بھی تھے، خواص بھی، عالم بھی تھے، ناخواندہ بھی، امیر بھی تھے اور مفلس بھی، صنعت کار بھی تھے اور مزدور طبقہ بھی نوجوان اور بزرگ بھی حتی کہ عملی حریت پسندوں کے ساتھ تخلیق کار، شعرا اور اخبارات و رسائل کے مدیران بھی ملک کی آزادی کی جنگ میں شریک تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی لیکن اِس ناکامی کے بعد ہندوستان کے عوام کا قومی

شعور بیدار ہوگیا اور ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور اپنے وطن عزیز کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی لگن روز بروز تیز ہوتی گئی ،بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں انڈین نیشنل کانگریس نے قومی انجمن کی شکل اختیار کرلی ،اس کے پرچم تلے ہندو،مسلم،سکھ،عیسائی متحد ہوکر وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے لگے،کانگریس جسے ہندوستانی عوام کی پرزور تائید کے ساتھ ساتھ ملک کے بہترین دماغوں کا تعاون حاصل تھا،ایک زبردست قوت بن کر ابھری،اس کے تحت تحریک آزادی نے جو طوفانی شکل اختیار کی ،اس نے انگریزی سامراج کے مضبوط قلعے کو متزلزل کردیا اِن سرفروشوں میں ہر فرقہ وطبقہ اور ہر مذہب وملت کے افراد شامل اور جن کے اتحاد نے قومی یکجہتی کی ایسی مثال پیش کی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔''(ص۱۹)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اِس ضمن میں مزید روشنی ڈالتے رقم طراز ہیں:

مسلم مجاہدین میں صنعت کار بھی ہیں اور مزدور بھی ،تعلیم یافتہ بھی ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی،میدان سیاست کے علاوہ اُن شاعروں ادیبوں صحافیوں اور قلم کاروں کے نام بھی شامل کیے گئے ہیں جنھوں نے اپنی شعری تخلیقات اور نثری تحریروں کے ذریعے عوام میں قومی شعور بیدار کیا اور ان میں آزادی کی روح پھونکی ،اس میں رسائل واخبارات کے مدیروں کا ذکر بھی شامل ہے،جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریز سامراج کی بد عنوانیوں کو بے نقاب کیا اور قلم کی تلوار سے انگریزوں سے

جنگ کی، اس جرم کی پاداش میں انہیں جیل بھیجا گیا، پھانسیاں دی گئیں اور ان کے مطابع ضبط کر لیے گئے لیکن وہ آخری دم تک اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر جدوجہد کرتے رہے۔'' (ص ۱۹)

ہزاروں مجاہدین آزادی میں معدودے چند تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں، باقی ماندہ کے نام زمانے کی گرد میں کھو گئے اور ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ یہ کتاب ایسے ہی گمنام شہیدان آزادی کے کارناموں اور قربانیوں کو منصۂ شہود پر لانے کی کامیاب کوشش ہے۔

مجاہدین آزادی کا یہ تذکرہ نہایت مستحسن قدم ہے اور اُسے ترتیب دے کر پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ایک غیر معمولی علمی وقومی خدمت انجام دی ہے۔ اس کی تیاری اور تکمیل میں پروفیسر صدیقی جو محنت، چھان بین وجستجو کی ہے، اس کے لیے وہ یقیناً داد کے مستحق ہیں۔ مجاہدین آزادی کے حالات وکوائف جمع کرنے میں وہ جس دشوار گزار مراحل سے دوچار ہوئے ہوں گے اُس کا اندازہ لگانا مشکل ہے صرف اتنا عرض کرنا ہی بہتر ہوگا کہ ہر عام وخاص، بالخصوص اس موضوع پر تحقیق کرنے والے اسکالرز کی ضرورت اور تسہیل میں رہنما ثابت ہوئی ہے۔

❀❀

جوشؔ کی تیرہ نظمیں: تنقیدی جائزہ

''جوشؔ کی تیرہ نظمیں'' پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ایک ایسی تصنیف ہے جسے اختصار نویسی کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے اور اپنے مجموعی حجم میں کئی اعتبار سے اہم ہے۔

موصوف نے ایک ذیلی عنوان ''جوش ایک نظر میں'' کے تحت جوشؔ کی تاریخ پیدائش نام ومقام اور تبدیلی نام کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے اجداد، والد، دادا، پردادا اور سکڑ داد کے نام بھی تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ جوشؔ کے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے اساتذہ کے اسمائے گرامی ساتھ ساتھ ان کے ابتدائی وثانوی اور سینئر سیکنڈری اسکولوں کے نام کے ساتھ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سینٹ پیٹرس کالج آگرہ اور شانتی نکیتن کا بھی معتبر ذرائع سے ذکر کیا ہے، جہاں جوشؔ ملیح آبادی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مذکورہ عنوان کے تحت جوشؔ کا نکاح ورخصتی مع سنین جوشؔ کی اہلیہ اوران کی اولادوں کے اسما کے علاوہ مختلف ملازمتوں کی تفصیل میں اداروں کے نام مع سنین اور مدت ملازمت کا ذکر کیا ہے اور اسی کے ذیل میں جوشؔ ملیح آبادی کی شعری اور نثری مطبوعہ تصانیف کی تفصیل درج کی ہے۔ بعدازاں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے جوشؔ کی مشہور زمانہ تیرہ نظموں کو موضوع بحث بناتے ہوئے حرف آغاز میں لکھا ہے:

> جوشؔ کی پہلی نظم ''ہلال محرم'' کے نام شائع ہوئی تھی اور پہلا مجموعہ ''نشر ونظم'' روح ادب ۱۹۲۰ء میں منظر عام پر آیا تھا، اس

کے بعد جوشؔ کے کلام مسلسل شائع ہوتے رہے۔ جوشؔ نے اردو شاعری کو عموماً اور اردو نظم کو خصوصاً ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا، ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے اور بڑی رنگا رنگی اور قادرالکلامی ہے، حسین جگمگاتی تشبیہیں پراثر منظر نگاری اور شاعرانہ مصوری کے بڑے جاذب نظر نمونے ملتے ہیں۔"(ص۶)

جوشؔ ملیح آبادی کے کلام کی پہلی خصوصیت ان کی فطری موروثی شاعرانہ صلاحیت ہے وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں کئی پشتوں سے شعروسخن کا ذوق وشوق تھا اور یہ شاعرانہ مزاج انہیں وراثت میں میسر آیا تھا۔ پروفیسر صدیقی جوشؔ کے شاعرانہ اسلوب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ تشبیہوں اور استعاروں کی جگمگاہٹ کو فنکاری کا درجۂ کمال تصور کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ انداز بیان جس قدر پرشور ہوگا، اُسی قدر کلام میں تاثیر پیدا ہوگی، اِسی لیے ان کے یہاں الفاظ کی گھن گرج لفظوں کی بازی گری اور سحر آفرینی ہے وہ مضمون سے زیادہ الفاظ کے ایجاد و اختراع اور بندش پر زور دیتے ہیں، جوشؔ کے کلام کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس شعر ڈھالنے کا ایک سانچہ ہے اور الفاظ کی ٹکسال ہے جس میں نظم، غزل، مرثیہ اور دیگر اصناف تشکیل پاتی ہیں۔"(ص۶)

یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی کے ہندوستانی شہریت ترک کرتے وقت پورے برصغیر میں ان کی شاعری کا شہرہ تھا، جبکہ اُس زمانے میں اردو فارسی شاعری کا چلن تھا، جوش ملیح آبادی کا کلام اِس روایت کی تصدیق کرتا ہے اور اسی پر اپنی بنیاد قائم کیے ہوئے ہے اگر چہ جوشؔ نے صنف غزل میں طبع آزمائی زیادہ نہیں کی، نظم اور رباعی پر زیادہ توجہ دی لیکن اُن کی

نظم گوئی سے بھی ہزار سالہ عجمی روایت کی گرفت کمزور نہیں پڑی، جوشؔ کی نظم گوئی کے حوالے سے پروفیسر صدیقی لکھتے ہیں:

> جوشؔ کا محاکاتی شعور بہت پختہ تھا،الفاظ کے ساتھ ساتھ منظرنگاری پر بھی انہیں یدطولیٰ حاصل تھی ''گرمی اور دیہاتی بازار'' منظرکشی اور پیکرتراشی کا بہترین نمونہ ہے۔ جوشؔ مناظر فطرت سے گہری دلچسپی رکھتے تھے جب وہ فطرت کے کسی منظر کی تصویر پیش کرتے ہیں تو اس میں ایک نغمگی پیدا ہوتی ہے۔ جوشؔ طبعیتاً حسن پرست واقع ہوئے تھے ان کے کلام میں حسن و جمال کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔''(ص ۸تا۹)

یہ بھی ایک تشریح طلب مسئلہ ہے، بظاہر جوشؔ کا غزل کے بجائے نظم کہنا اس وقت کے نئے تقاضوں کے منشا کے عین مطابق تھا بلکہ جوشؔ موضوعات سے بھی عصری تقاضوں کو پورا کر رہے تھے۔ مثلاً مزدور کی تعریف، مناظر فطرت کی عکاسی، عقل پسندی کی ترویج، سرمایہ داروں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار، مذہب و مولوی کی استہزا کا بیان بہت خاص ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی جوشؔ کی نظم ''فتنۂ خانقاہ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے رقم طراز ہیں:

> جوشؔ نے سماج کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا، وہ اپنی ایک نظم ''فتنۂ خانقاہ'' میں خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے شیوخ کا مضحکہ اڑاتے ہیں یہ منظر کچھ اس طرح ہے کہ جب ایک دوشیزہ کسی خانقاہ میں فاتحہ پڑھنے کے لیے جاتی ہے تو خانقاہ میں داخل ہوتے ہی شیوخ کا ایمان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔''(ص ۱۰)

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں نظم کا معیار بدل رہا تھا جس میں ترقی پسند شاعر اور حلقہ ارباب ذوق سے متعلق شعرا برابر کے شریک تھے، جوشؔ ملیح آبادی کا زمانہ سیاسی بیداری اور غیر ملکی سامراجیت کے خلاف جدوجہد، معاشرے میں پھیلے ہوئے معاشی اور مذہبی استحصال

سراسیمگی نفرت کا زمانہ تھا، چاروں طرف نفرت اور ظلم و استبداد کے بادل چھائے ہوئے تھے لہٰذا جوشؔ کو عصری تقاضوں کے زیر اثر پیام بھی دینا تھا اور عوام کو بغاوت کے لیے آمادہ بھی کرنا تھا، ریا کاریوں سے پردہ بھی اٹھانا تھا اور اپنے منفرد لب و لہجے کے ساتھ رونق افروز اور جلوہ کناں بھی رہنا تھا۔ جوشؔ کی تمام تر شاعرانہ اور فنکارانہ خوبیوں کے ان پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضمون کا مندرجہ ذیل اقباس بہت اہم ہے:

> جوشؔ کو خود ہی اپنے موضوعات ونظریات کے پیچ وخم کا علم نہیں ہوتا اس لیے ایک وقت میں کسی سے سن کر جو بات کہتے ہیں دوسرے وقت میں بالکل اس سے الٹی بات کہہ دیتے ہیں۔''
>
> (ص۱۲)

اِسی سیاق میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے نکتہ سرائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> جوشؔ کی طبیعت میں تضاد ہے، ان کے یہاں لامرکزیت ہے جس کی وجہ سے وہ کسی ایک خاص رجحان یا نظریے پر ارتکاز نہیں کر پاتے نثر میں بھی انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی آخری تصنیف ''یادوں کی بارات'' ایک ہنگامہ خیز خودنوشت ہے، جو اُن کی نثر نگاری کے مخصوص اسلوب کا نمونہ ہے۔ جوشؔ اردو شاعری کی آبرو ہیں، ان کا فن زندہ اور ان کی شعری اقدار مسلّم ہیں، بعض خامیوں کے باوجود ان کے ادبی کارنامے اردو شاعری میں برسوں یاد کیے جائیں گے۔''
>
> (ص۱۲تا۱۳)

علاوہ بریں جوشؔ پر پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا انتخاب ''جوشؔ کی تیرہ نظمیں'' نہایت اہم انتخاب ہے، اِن نظموں میں ''شکست زندہ کا خواب، بغاوت، ایسٹ انڈیا کمپنی، کسان ذاکر سے خطاب، گنگا کے گھاٹ پر، کہتان دکن کی عورتیں، فتنۂ خانقاہ، نقاد، سہاگن بیوہ، جنگل کی

شہزادی البیلی صبح، گرمی اور دیہاتی بازار‘‘اور’’بدلی کا چاند‘‘ فنی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ یہ انتخاب موضوع کی مناسبت سے نصابی ضرورتوں کے پیشِ نظر طلبہ کو بنیادی معلومات فراہم کرانے میں معاون ہے۔اس کے علاوہ باذوق قارئین کے لئے بھی کم دلچسپ نہیں۔

❁❁

اِقبال سہیلؔ کا فن: ایک تحقیقی مطالعہ

ہندوستان کی مختلف النوع زبانوں میں جو قوت اور تخلیقی توانائی اردو تحقیق کے حوالے سے اردو زبان کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری زبان کو میسر نہیں آئی یہ بہت جلد اپنے لب و لہجے اور شیرینی کی وجہ سے سب کی دلعزیزی حاصل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

اُردو زبان کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے حوالے سے بیسویں صدی کا زمانہ غیر معمولی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دور کے شعر و ادب میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایسا دور ہے جس میں آزادی کی تحریک عروج پر تھی، حریت پسندوں کے ساتھ اردو شاعروں اور ادیبوں نے بھی قلم کے جوہر دکھائے بلکہ پورے خلوص و انہماک سے آزادی کی لڑائی میں بھرپور حصہ لیا۔

اُس زمانے کے شعرا کے کلام میں عام طور پر فلسفیانہ خیالات و متصوفانہ عناصر، حیات و ممکنات اور حسن و عشق کے مفاہیم شعریت کے سانچے میں لے گئے لیکن اِسی دور میں چکبستؔ، حسرتؔ موہانی اور دیگر شعرا کے یہاں سیاسی فکر و خیال، شعری پیکر میں اس طرح تحلیل ہوتے رہے کہ شاعری اور سیاست ایک پہلو کے دو رخ بن گئے۔

اُس دور کے اہل سخن کے ساتھ بیسویں صدی کا ایک اہم نام اکثر و بیشتر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جس نے اپنے نفیس جذبات سے بھرپور ایک طرف اپنے شعری کلام میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے گیت گائے تو دوسری طرف سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ پیش کیا، اِس

کے ماسوا فلسفہ، حکمت، منطق، دین و مذہب، نفسیات اخلاقیات اور مختلف شعبۂ ہائے زندگی کے ادق پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی، یہاں راقم کی مراد اقبال سہیلؔ سے ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مذکورہ بالا کتاب ''اقبال سہیلؔ کا فن'' اِسی خلا کو پر کرنے کی ایک بہترین اور کامیاب کوشش ہے، جسے موصوف نے اردو ادب کے معروف محققین و ناقدین، مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، سید سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرورؔ، اثرؔ لکھنوی، علی جواد زیدی، مرزا احساس بیگ، ڈاکٹر بدرالدین الحافظ، عطیہ خلیل عرب، ڈاکٹر احسن بیگ، ڈاکٹر اخلاق احمد کے وقیع مقالات کو ترتیب دے کر ایک غیر معمولی کام انجام دیا ہے، جس کے لیے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی شرف تحسین کے مستحق ہیں۔ کتاب میں شامل پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے مقالہ کے علاوہ اقبال سہیلؔ کے دو مضمون ''علامہ شبلی کے مکاتب'' اور ''شبلی کی جامعیت'' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر مشیر الحق (مرحوم) کا اقبال سہیلؔ کے تعلق سے آخری خط بھی شامل کتاب ہے۔

پروفیسر مشیر الحق (مرحوم) کا اقبال سہیلؔ کے تعلق سے آخری خط بھی قابل ذکر ہے۔

مذکورہ کتاب میں شامل مضامین کے مطالعہ سے اقبال سہیلؔ کی ادبی عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے قبل، اقبال سہیلؔ کے حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے وہ خیالات نقل کرنا ناگزیر ہیں جن کا اظہار موصوف نے سطور اولیں میں کیا ہے:

> اُردو ادب کی تاریخ چند ایسی قدآور شخصیتوں کے ذکر سے محروم ہے جن کے فن پارے وقت کی گرد میں دب کر رہ گئے اور ناقدین نے بھی ان کے فن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ خطۂ اعظم گڑھ کی ایک ایسی ہی عظیم المرتبت شخصیت اقبال سہیلؔ تھے جنھوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو شاعری کی آبیاری میں صرف کر دیا اُن کے وارثوں میں سے تو کسی کو شعر و ادب سے کوئی خاص دلچسپی

نہیں رہی البتہ گذشتہ چند برسوں میں اقبال سہیلؔ پر ایک تحقیقی
مقالہ کلیات سہیلؔ اور انتخابات مختلف اداروں کے شائع ہو کر
منظر عام پر آئے ہیں۔''(سطور اولیں)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے جن قد آور ادبی شخصیات کے منتخب مضامین کی ترتیب اور مذکورہ کتاب کی تزئین کاری کے ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

گذشتہ کئی دہائیوں سے اقبال سہیلؔ پر تنقیدی نوعیت کی کوئی
جامع اور مبسوط کتاب شائع نہیں ہوئی جس سے ان کی ادبی
خدمات کا کسی حد تک حق ادا ہو سکے، برسوں سے ادبی حلقوں
میں اس نوع کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اسی
ضرورت کے پیش نظر خاکسار نے اقبال سہیلؔ کے فن پر ایک
مبسوط اور جامع کتاب ترتیب دینے کا ارادہ کیا مضامین کی
فراہمی کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ موضوع سے متعلق
مواد مختلف کتب اور رسائل سے حاصل کیا نیز زندگی کے
تجربات سے بھی مدد لی، بایں ہمہ جو کمی محسوس کی اس کو
پورا کرنے کے لیے مختلف اہل قلم سے رجوع کیا۔''(ص ۷)

اقبال سہیلؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے، ان کی زندگی ایک ایسی بند کتاب کی مانند ہے جس کے متعدد ابواب آج بھی اپنی قرأت کے منتظر ہیں۔ اقبال سہیلؔ کے دماغ پر شبلی نعمانی اس حد تک چھائے ہوئے تھے کہ ان کے نمایاں اثرات، اقبال سہیلؔ کی تحریر و تقریر اور فکر و خیال پر پڑا۔ اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

اقبال سہیلؔ، علامہ شبلی کے تلامذہ میں سے تھے، انہیں شاعری
کے علاوہ نثر سے گہری دلچسپی تھی، نثر میں ان کی متعدد تحریریں
ملتی ہیں اس کتاب میں علامہ شبلی پر اقبال سہیلؔ کی دو تحریریں

''شبلی کی جامعیت'' اور ''علامہ شبلی مکاتیب'' نمونے کے طور پر
شامل کی گئیں ہیں۔ اِن تحریروں کے ذریعہ سہیلؔ کی نثری کے
معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔'' (ص ۸)

مذکورہ کتاب میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اقبال سہیلؔ کے تعلق سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے تاثرات شامل کیے ہیں جن سے موصوف کی عظمت کا تعین کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے تاثراتی مضمون میں لکھتے ہیں:

علی گڑھ میں شعر اور تنقید و ادب کے امام سہیلؔ تھے۔ پچھلے
چالیس سال میں بہت کچھ سنا اور دیکھا مگر میرے دل پر
مولانا کی شاعری اور ان کی خطابت کا جو نقش کالج کی طالب
علمی کے زمانے میں جم گیا تھا، وہ اِس وقت بھی اتنا ہی گہرا ہے
جتنا اُس وقت تھا۔ شعر و سخن سے قطع نظر ان جیسا ذہین شخص اب
تک کہیں دیکھنے میں نہ آیا، بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ طالب علمی
کے زمانے میں جن شخصیتوں نے مجھ پر سب سے زیادہ
اثر کیا، ان میں سہیلؔ کسی سے پیچھے نہیں ،ان کی شاعری
،خطابت اور ذہانت کے نقش کتنے ہی گہرے سہی مگر ایک نقش
ان سب سے زیادہ گہرا دل پر دکھائی دیتا ہے اور وہ ان کی محبت
اور شفقت کا نقش ہے۔ محبت کے لیے استحقاق ضروری نہیں
،اس لعل کو اپنی ہستی کی گدڑی میں لپیٹے ہوئے ہوں اور بے
استحقاق اس پر فخر کرتا ہوں۔'' (ص ۹)

اہل ادب اور ارباب نظر نے اقبال سہیلؔ کی ادبی و اخلاقی صلاحیتوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے محمد حسن کالج میگزین (جونپور) کے ''سہیلؔ نمبر'' سے سلیمان ندوی کا ایک وقیع مضمون ''تابش سہیل'' شامل کیا ہے، جس میں موصوف ایک

جگہ رقم طراز ہیں:

پرانے شعرا میں قصیدہ گو اور غزل گو شعرا الگ الگ ہوتے تھے ،قصیدہ گو غزل میں اور غزل گو قصیدہ میں کامیاب نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ دونوں کی زبانیں الگ ہوتی ہیں مگر مستثنیٰ اشخاص بھی ہیں جو دونوں مملکتوں پر ایک ساتھ حکمراں ہیں جیسے قدما میں سعدیؔ، متوسطین میں عرفیؔ اور اخیر دور میں مولانا شبلی مرحوم، سہیلؔ صاحب بھی انہیں مستثنیٰ قابلیت کے لوگوں میں ہیں، جو قصیدہ اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔'' (ص۱۲)

قوم پروری اور حب الوطنی اقبال سہیلؔ کی فطرت کا حصہ تھی ،قوم کی خدمت میں جہاں ایک طرف سیاست میں حصہ لیتے، وہیں دوسری طرف اپنے زور قلم سے جبر اور باطل قوت کو للکارنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اس حوالے سے رشید احمد صدیقی کا مقالہ ''مولانا سہیل میری نظر میں''، بہت اہم جسے پروفیسر صدیقی نے کتاب کا حصہ بنایا ہے؛ اس ایک کا مختصر اقتباس نقل کرنا ناگزیر ہے:

انگریز حکومت ،انگریزی طور طریقوں اور خود انگریزوں سے مولانا ہمیشہ بیزار رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بیزاری ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہو، سبب یہ تھا کہ غدر کے بعد مسلمان علما اور شرفا پر انگریزی حکومت نے جو ستم ڈھائے، اس کا اُن پر بہت اثر تھا۔ اس طرح کے واقعات کبھی کبھی بڑی حسرت والم سے سناتے اردو شاعری کو سیاسی نظمیں شبلیؔ اور ظفر علی خاں نے دیں لیکن غزل میں سیاسی طنز کے نوک ونشتر سہیلؔ کا عطیہ ہے ۔ مولانا محمد علی کی غزلوں میں بھی یہ رنگ ملتا ہے سہیلؔ میں یہ بات شبلیؔ سے آئی لیکن نشتریت کا التزام اِرادی

اور شعوری طور پر جتنا سہیلؔ کی غزلوں میں ہے اتنا شبلیؔ کے ہاں
ہے نہ محمد علی یا حسرتؔ کے ہاں۔'' (ص۱۹)

سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں شبلیؔ نعمانی علی گڑھ سے اعظم گڑھ واپس آ گئے اور وطن عزیز پہنچ کر ان کا مقصد صرف تصنیف و تالیف کی اشاعت اور ادب کی خدمت انجام دینا رہا، یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال سہیلؔ کو شبلیؔ نعمانی کے حلقہ میں شامل ہونے کا موقع ملا اُس وقت انھوں نے شبلیؔ سے دیوان ''حماسہ، بحرالعلوم، شرح مسلم، عقد الفرید'' وغیرہ کا درس لیا پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے آل احمد سرور کا عالمانہ مقالہ ''سہیلؔ کا تغزل'' شامل کیا ہے جس میں موصوف اقبال سہیلؔ کی شاعرانہ خوبیوں کا احاطہ اِس طرح کرتے ہیں:

مولانا سہیلؔ کے کلام کی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اردو ادب پر شبلیؔ کے اثرات کو سمجھنا ضروری ہے۔ شبلیؔ کا جذبۂ حریت، ان کا علمی تجر اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ شوخی اور نکتہ سنجی جس طرح مولانا سہیلؔ کے یہاں آئی ہے، اور کسی کے یہاں نہیں، شبلیؔ کے الفاظ میں دوسروں کے کفر میں بوئے ایما بھی ہے، مولانا سہیلؔ راہ سلوک میں دو دل نہیں ہیں اور اس لیے ان کے شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، علم و فضل کے باوجود وہ شاعری کی محفل میں حسن کاری اور شگفتگی کی دولت بیدار لے کر آئے ہیں انہیں مہدی کے الفاظ میں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ مولانا سہیلؔ پر رشید احمد صاحب نے جو مضمون لکھا ہے، اُس سے اُن کی شخصیت پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے۔ مولانا کی ذہانت، اُن کی عربی اور فارسی کی غیر معمولی معلومات، اُن کی طلاقت لسانی، اُن کی بے پناہ علمیت اور اس کے ساتھ اُن کا لااُبالی پن، بے نیازی، اُصول

پرستی کی کمی، حریفوں سے معرکہ آرائی میں جگرداری سے زیادہ فتح وشکست کا خیال، اُن کی قوم پرستی علی گڑھ کالج کے ہنگامہ پرفضا میں اُن کی بھرپور زندگی، اس روشن مرقع سے پوری طرح اجاگر ہوجاتی ہے۔'' (ص۲۱)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن کی تالیف ''اقبال سہیلؔ کا فن'' میں شامل آثرؔ لکھنوی کا مقالہ ''اردو غزل میں سہیلؔ کا مرتبہ'' اِس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اردو شعر ادب کی تاریخ اقبال سہیلؔ جیسے قدآور اور فطین وذہین شخصیت سے محروم نظر آتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

اُس وقت کے مشاہیر شعرا میں حسرتؔ، فانیؔ اصغرؔ، جگرؔ کا شمار ہے سہیلؔ کو قطعاً نظر انداز کیا جاتا ہے، حالاں کہ میرا دعویٰ ہے کہ جو خوبیاں اِن حضرات کے کلام میں فرداً فرداً ہیں، سہیلؔ کا کلام اُن سب کا مجموعہ اور اس کے ماسوا اور بہت کچھ ہے۔ نہ تو سہیلؔ کی طرح اُن حضرات کا علم بسیط اور متنوع تھا، نہ اُن کو وہ مواقع نصیب ہوئے جو سہیلؔ کو حاصل تھے، مثلاً شاندار خاندانی روایات، مولانا شبلیؔ اور مولانا فراہی کا تلمذ اور فیضِ صحبت و تربیت، ان میں سے کسی کا حافظہ نہ اتنا قوی اور ہمہ گیر تھا نہ ان میں کوئی ایسا فصیح وعذاب البیان تھا، نہ ایسا زبردست مقرر اور فی البدیہہ اشعار کہنے والا تھا، نہ کسی میں تمدنی وسیاسی مسائل کو شاعرانہ لطافت قائم رکھتے ہوئے نظم کرنے کی صلاحیت تھی، یہ سب صرف غزل گو شاعر تھے۔ سہیلؔ کو قصائد و دیگر اصناف سخن میں بھی یدطولیٰ تھا۔ آخر میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ سہیلؔ کی غزلیہ شاعری کے محاسن دکھانے اور دوسرے مشاہیر سے موازنہ کرنے میں میرا مقصود صرف یہ ہے کہ غزل کے میدان

میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں، دوسرے اصناف سخن میں تو ان کا مدمقابل اس دور میں پیدا ہی نہیں، سہیلؔ کو نظر انداز کرنا اپنے آپ کو ایک بڑی ادبی نعمت سے محروم رکھنا ہے۔'' (ص ۳۸)

رشید احمد صدیقی اپنے دوسرے مضمون میں اقبال سہیلؔ کے زمانہ طالب علمی و دیگر کوائف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

مولانا کالج میں فارغ التحصیل عیالداری کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے ایف .اے پاس کر کے آئے تھے ،بی.اے میں داخل ہوئے اور ایم.اے ایل ایل بی ہو کر نکلے، چار برس کالج میں رہے، بورڈر تھے لیکن تمام زمانہ دوسروں کے کمروں میں گذرا ،دن کا تو کیا ذکر ،رات ہوئی جس کمرے میں ہوتے وہیں رات گذار دیتے ،اب کمرے والے کو یا تو شعر سنا رہے ہیں یا اس کے لیے کوئی نظم لکھ رہے ہیں یا اُس کو اقتصادیات ،فلسفہ، تاریخ الٰہیات ، فارسی ،عربی ،شعر و شاعری پر لیکچر دیتے ہوتے ورنہ پھر آم ،پان زمینداری ،مذہب،عورتوں کی اقسام،مردوں کے امراض ،مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دیتے دیتے زائد چارپائی کا انتظام ہوا تو خیر ورنہ کسی کے ساتھ اُسی کی چارپائی پر شکن بستر ہو جاتے۔'' (ص ٦٨)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے علی جواد زیدی کا وہ مضمون شامل کیا ہے جو اقبال سہیلؔ کی زندگی میں ہی ماہنامہ ''نیا دور'' (لکھنو) میں شائع ہوا تھا۔علی جواد زیدی ،اقبال سہیلؔ کی ذہانت ذکاوت کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی غزل گوئی میں سیاسی معنویت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

سہیلؔ ادب کے صحیح نباض ہیں ،اردو ہو یا فارسی ،دونوں ہی زبانوں پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔الفاظ تو ان کے اشاروں

> کے پابند ہیں وہ عربی، فارسی اور اردو ادب پر غائر نظر رکھتے ہیں انگریزی کے بھی گریجویٹ ہیں لیکن ان کی شاعری پر کہیں بھی تقلید کا رنگ نہیں آنے پایا ہے۔ اردو ادب میں یہ انفرادیت بہت کم شاعروں اور ادیبوں کے حصہ میں آئی ہے۔ سہیلؔ ایک طرز خاص کے مالک ہیں اور وسعت معلومات کے بغیر اس طرز کو اپنانا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ روایات سخن کے اعتبار سے سہیلؔ جدید شاعری سے متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ ادبی تحریکات پر تفصیل سے بحث بھی کر سکتے ہیں لیکن مستقل ادبی تصنیف میں ان کا جی نہیں لگتا، ایک بار ''حیات شبلی'' لکھنا شروع کی تھی مگر ایک طویل تمہید لکھ کر خاموش ہو گئے، مستقل تصنیف کے لیے جس عرق ریزی کی ضرورت ہے، اس کے ثواب سے سہیلؔ واقف تو ہیں پر طبیعت ادھر نہیں آئی۔ اردو ادب کو سہیلؔ نے خاص شے عطا کی ہے، سیاسی غزل ویسے تو حسرتؔ موہانی اور فراقؔ گورکھپوری کے یہاں بھی سیاسی اُسارے ملتے ہیں لیکن اقبال سہیلؔ نے غزل کے کنایات و اشارات کو ایک نئی سیاسی معنویت عطا کی جس کی بنیادوں پر فیضؔ کی شاعری کی عمارت بنی اور جس کی خوشہ چینی موجودہ دور کے بہت سے ادبا و شعرا کر رہے ہیں۔ (ص ۸۷تا۸۸)

ہیئت کے اعتبار سے اقبال سہیلؔ نے مثلث، مخمس، مسدس، مثمن، ترکیب بند غرض کہ موصوف نے تمام ہیئتی تجربے کیے، اقبال سہیلؔ کا تمام شعری سرمایہ مثلاً غزل گوئی، نظم نگاری، قصیدہ اور متفرقات کے تحت مرثیہ نگاری، مثنوی، رباعی گوئی، قطعہ اور سہرا نگاری پر مشتمل ہے۔ اِس حوالے سے مرزا احسان احمد کے مضمون کا یہ اقتباس بہت اہم ہے:

سہیلؔ کے ہمہ گیر دماغ کو غزل ،قصیدہ ،مثنوی ،قطعہ ،رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی ،جب اور جو لکھ لکھنا چاہتے تھے ان کے قلم کی روانی اور برجستگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔غیر معمولی قوت نظم کے علاوہ عربی اور فارسی تعلیم کی بدولت ان کے دماغ میں ہر قسم کے فصیح و بلیغ الفاظ اور لطیف و نازک ترکیبوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا۔اس لیے شاعری کے کسی میدان میں ان کے طائر خیال کو عجز و درماندگی کا احساس نہیں ہوسکتا تھا لیکن واقعیہ ہے کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا اصلی تماشا گاہ کچھ قصیدہ ہی کا میدان تھا جہاں کسی اور کو ان کے سامنے حریف مقابل بن کر کھڑے ہونے کی مشکل سے جرأت ہوسکتی تھی۔''(ص ۹۵)

اِس نظریہ سے اتفاق کرنا مشکل ضرور ہے لیکن یہ بات بھی سچائی پر مبنی ہے کہ نعت کہتے وقت عموماً شعرا،شعریت کو ذہن میں نہ رکھتے ہوئے مصنوعی تعریفوں اور ثواب پر نظر رکھتے ہیں لیکن اردو میں اِس ذیل میں بہت حد تک حالیؔ ،اقبالؔ ،محسن کاکوری اور اقبال سہیلؔ کے علاوہ فی زمانہ نعتیہ شاعری کے ذریعے عام شاعری کے معیاروں سے آگے کا سفر طے کرنے میں تھکان محسوس کرتے ہیں۔

اگر اِس حوالے سے اقبال سہیلؔ کا ذکر کریں تو وہ قصیدوں میں اپنے ممدوح کو اپنے نظریے سے دیکھتے ہیں۔اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے نعتیہ کلام میں ملک کے مسائل، قوم کی زبوں حالی اور ملک کی غلامی سے بیزار اور انگریزوں کے استبدادی نظام ، جبر کا دکھ سرور کائناتؐ سے مخاطب نظر آتا ہے۔

اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ڈاکٹر بدرالدین الحافظ کا مضمون ''اقبال سہیلؔ کی نعت و منقبت'' شامل کیا ہے،جس میں وہ لکھتے ہیں:

علامہ اقبال سہیلؔ کے نعتیہ کلام میں ہمیں سب سے بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ وہ کلام الٰہی، احادیث مبارکہ اور غزلی تعبیرات کے جواہر پاروں کو جگہ جگہ سے چنتے ہوئے اپنے اشعار میں ایسے جڑتے ہیں جیسے الفاظ کے سچّے موتیوں والے ہار میں جابجا ہیرے لگا دیے ہوں اور اُس میں ذرّہ برابر کہیں بے اعتدالی نظر نہیں آتی، کہیں حد سے تجاوز نہیں ہوتا، مدح ونعت کی وادیٔ الفت میں وہ کہیں لغزش سے ہمکنار نظر نہیں آتے چوں کہ علامہ عربی زبان سے پوری طرح واقف تھے اور قرآن وحدیث پر پوری طرح ان کی نظر تھی، اس لیے نعت ومنقبت میں جابجا ان کی بلیغ تلمیحات ملتی ہیں۔ اِس انفرادیت کے ساتھ عمالہ اقبال سہیلؔ، حالیؔ اور مولانا ظفر علی خاں جیسے شعرا کی تاریخی تلمیحات میں بھی ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔''

(ص۱۲۳تا۱۳۳)

اقبال سہیلؔ کی ادبی عبقریت کسی ایک صنف سخن تک محدود نہیں، بلکہ ان کے ہمہ گیر ذہن نے شاعری کی ہر شاخ کو متاثر کیا، جب اردو کا غزلیہ کلام رومان وتصوف کے دھندلکوں میں گم تھا اُس وقت اقبال سہیلؔ نے اسے سماجی اور سیاسی حقائق سے روشناس کرایا۔ اقبال سہیلؔ کی غیر معمولی فطانت وعبقریت کے ذکر میں پروفیسر صدیقی نے اپنی تصنیف میں عطیہ خلیل عرب کا مضمون شامل کیا ہے جس کا مندرجہ ذیل اقتباس، جس میں انھوں نے اقبال سہیلؔ کو مزید سمجھنے کی دعوت دی ہے:

ائمہ فکروفن کے اس اعتراف وتصدیق کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سہیلؔ کے ادبی کمالات کا ابھی مکمل تجزیہ نہیں ہوسکا، ان کے فن کی گہرائی اُن کے افکار کی قوت وتاثیر، اُن

کے طرز ادا کی جدت وندرت اور ان کے نظریۂ حیات کی
وسعت اس بات کی مقتضی ہے کہ ان کی تخلیقات کے رموز ونکار
کو سمجھا جائے اور انہیں سلیقہ سے منظر عام پر لایا جائے تا کہ عام
اردو دنیا سہیلؔ کی اہمیت وعظمت کو محسوس کر سکے۔'' (ص ۱۳۹)

شبلی نعمانی کی قربتوں سے اقبال سہیلؔ کے اندر وہ قابلیت وصلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ سرسید کی تحریک اور دیگر سیاسی تحریکوں کے مقاصد سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان کی تہہ تک پہنچ سکیں، حسرتؔ موہانی اور وحید الدین جیسے مشاہیر علم وادب کے درمیان رہ کر بھی اقبال سہیلؔ کی ذہنی تربیت خوب پروان چڑھی ان کے سیاسی نظریات کو استحکام حاصل ہوا، اپنی ذہانت اور قوت حافظہ کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد اپنے زمانے کے دانشوروں میں منفرد مقام حاصل کرلیا یعنی وہ ایسا دور تھا کہ جب ہندوستانی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور سامراجی طاقتوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم چکے تھے نیز ہندوستان کی دو بڑی اکائیوں کو آپس میں دست وگریباں کرانے کے عزائم کا عکس نظر آنے لگا تھا، ایسے وقت میں جن شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے ہندوستانیوں کو متحد کرنے کی کوشش کی، اُن میں اقبال سہیلؔ بہت اہم نظر آتے ہیں۔

اقبال سہیلؔ کے کلام کے مطالعے سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں حب الوطنی قومی یکجہتی اور ایثار وقربانی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا نیز وطن سے محبت اور ملی اتحاد کے عناصر ہندوستان کی تحریک آزادی کی حمایت اور انگریز دشمنی اقبال سہیلؔ کے خمیر میں موجود تھی۔ انھوں نے اپنی قومی شاعری کے ذریعے عوام کے دلوں میں جوش وولولہ پیدا کیا۔ اقبال سہیلؔ کا یہ فنی امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جنگ آزادی کی تاریخ، تمام وکمال لطافتوں کے ساتھ پیوست کردی ہیں۔ اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تالیف ''اقبال سہیل کا فن'' میں ڈاکٹر احسن بیگ کا اہم مقالہ ''اقبال سہیلؔ کی قومی شاعری'' شامل کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

اقبال سہیلؔ کے کلام میں سیاسی بیداری بیسویں صدی کے
اوائل میں نظر آتی ہے، بعد ازاں زمانہ اور حالات کے تقاضوں

نے اِس شعور کو پختگی عطا کی ،انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے اوائل میں ملک کے اندر مختلف تحریکوں نے جنم لیا جن کا نصب العین مادر ہند کی تعمیر و ترقی تھا۔ یہ دور اِس لحاظ سے بھی کم اہمیت کا حامل نہیں کہ سیاسی اور اجتماعی شعور میں پختگی کے ساتھ قوم کے لوگوں نے نئے حالات کو قبول کرنے اور آزادی کو حاصل کرنے کے لیے جس قسم کی جدوجہد کی ضرورت تھی ،وہ پوری کرنے کی کوشش کی ۔ سہیلؔ حالات کی نزاکتوں سے کبھی غافل نہیں رہے ،برطانوی حکومت کی عیاریاں ،فرقہ پرست عناصر کی شاطرانہ چالیں ،مسلم لیگ اور کانگریس کی کشاکش ،قوم کے سپوتوں میں جدوجہد آزادی کا جذبہ ،جمہوریت کی بحالی کا تصور اور ملک کی تعمیر و ترقی کا احساس غرضیکہ بیشتر سیاسی واقعات اور سماجی کیفیات اُن کی غزلوں کو بقائے دوام بخشتے ہیں۔'' (ص ۱۵۴ تا ۱۵۶)

اقبال سہیلؔ کو اپنے دوست واحباب ،بزرگوں اور بچّوں سے بہت محبت تھی ،جو کچھ کماتے ،اسے دوسروں پر خرچ کر دیتے ،قناعت وخودداری حد درجہ تھی ،ان کے اندر فطری طور پر سعادت مندی ،اخلاص خوش مزاجی اور بے غرض انسانیت اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔اس حوالے سے پروفیسر صدیقی نے اپنے کتاب میں ڈاکٹر اخلاق احمد کا مضمون ''اقبال سہیلؔ'' شامل کیا ہے ،جس میں موصوف نے اقبال سہیلؔ کی زندگی مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے ان کے عادات واطوار پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

سہیلؔ نرم دل اور مروت والے انسان تھے ،جاہ وحشم واقتدار کے قائل نہ تھے ،پیسہ جمع کرنے سے زیادہ خرچ کرنے میں راحت محسوس کرتے اخیر عمر میں کہا کرتے تھے کہ ان ہاتھوں

نے تقریباً تین لاکھ روپے کمائے لیکن آج ایک پیسہ بھی جمع نہیں ہے۔ایک مرتبہ گھر میں کوئی بیمار پڑ گیا، بیماری نے طول پکڑا تو کہنے لگے،شاید کسی کے پاس کوئی رقم جمع ہوگئی ہے، پتہ چلا کسی عزیزہ کے پاس ڈیڑھ سو روپے ہیں ،فوراً ان کو خرچ کرنے کو کہا گیا تاکہ بیماری سے نجات ملے۔''

(ص ۱۶۵ تا ۱۶۶)

شعری اصناف میں غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں زندگی کے تمام وکمال حقائق بیان کیے جاسکتے ہیں، ایجاز واختصار غزل کا امتیاز ہے۔غزل میں زندگی کا کرب، حزنیہ اور طربیہ لمحات کا بیان، درد وکسک اور فکر وخیال کی پاکیزگی، غرض یہ کہ غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں نرم ونازک نازک، مؤثر اور خوبصورت مفہوم نظم کیے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تالیف ''اقبال سہیلؔ کا فن'' میں ان کا بھی ایک معیاری مضمون موجود ہے جس میں موصوف نے اقبال سہیلؔ کی پیدائش، زندگی کے حالات وکوائف پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کی شاعرانہ عظمت کا احاطہ مختلف اشعار کی روشنی میں، اِن الفاظ میں کیا ہے:

غزل کے فن پر سہیلؔ کی گرفت بہت دبیز تھی، اُن کی غزلوں میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید افکار کا بیان بھی ملتا ہے۔سہیلؔ نے تغزل کی تمام صالح روایات اور عبارت اشارت اور ادا کے تمام آداب برتے ہیں ،اُن کے اشعار کی عام شگفتگی میں غالبؔ اور مومنؔ کی سی لطیف تراکیب سے اور بھی حسن پیدا ہوجاتا ہے۔اُن کی فکر لالہ کار اور تازہ کار ہے جذباتیت کے مقابلے میں ان کے یہاں جوش بیان کا احساس ہوتا ہے۔سہیلؔ کے انداز بیان میں ہمواری ہے مگر اکتا دینے والی یکسانیت نہیں ہے، وہ اپنے صاحب طرز متاخرین میں کسی

سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ ان سے منفرد نظر آتے ہیں۔''

(ص ۱۷۴ تا ۱۷۵)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کتاب میں اقبال سہیل کا ایک مضمون ''مکاتیب شبلی'' کے عنوان سے بھی شامل کیا ہے۔ اردو کے نثری ادب میں خطوط و مکاتیب کی اہمیت وافادیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور مکتوبات کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی وساطت سے اردو ادب کے غیر افسانوی ادب میں بعض اصناف کو تقویت و مہارت کے ساتھ پیش کرنے میں مدد ملتی ہے۔

غالب کے بعد جن مشاہیر علم وفن نے مکتوب نگاری پر توجہ دی ان میں سرسید احمد خاں ، محمد حسین آزاد، حالی، نذیر احمد،، داغ، اکبرالہ آبادی، امیر مینائی کے نام قابل ذکر ہیں۔

''مکاتیب شبلی'' علامہ شبلی نعمانی کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے نام تحریر کیے تھے، جن میں عموماً علمی ، اصلاحی اور فکری خیالات کی تلقین کی گئی ہے۔ اقبال سہیل، شبلی کے مکتوبات کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اپنے کسی دوست یا شاگرد یا کسی بے تکلف ملنے والوں کو خط لکھتے وقت کوئی پردہ داری یا اخفائے راز کی کوشش نہیں ہوتی، جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی بے ساختہ زبان قلم سے تراوش کر جاتا ہے اور جس طرح کا مکتوب الیہ ہوتا ہے اور جس دماغی ساخت یا مذہبی رجحان یا قومی نظریہ کا وہ ہوتا ہے خط لکھنے والا اسی کے فہم وادراک کے مطابق باتیں کرتا ہے اور جن لوگوں کے اوقات ، اہم مسائل زندگی کو حل کرنے میں مشغول اور مصروف ہوتے ہیں، ان کے پاس خط نویسی کے لیے عبارت کا اختصار اور اظہار مطالب کے لیے بیان کی سادگی ضرور ہوتی ہے، بعض اوقات تو علامہ شبلی کے خطوط محض ہاں اور نہیں پر ختم ہوجاتے ہیں۔'' (ص ۱۸۳)

اقبال سہیلؔ کے مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؔ نعمانی کے خطوط انشاپردازی کے بہترین نمونے ہیں۔شبلی نعمانی کے مکاتیب میں ان کے معاصرین میں برگزیدہ شخصیات اور طالب علموں کے حالات زندگی کو بھی اپنے خطوط کا موضوع بنایا ہے۔علاوہ ازیں قوم وملت کے عقائد کی فکر میں اصلاحی انجمنوں اور مکاتیب کے قیام کو بھی دوسرے احباب کے سامنے رکھتے ہیں،صرف اتنا ہی نہیں شبلی نعمانی نے اپنے خطوط کے وسیلے سے اصلاح اِملا اور اصلاح زبان کا کام بھی کیا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تصنیف میں آخری مضمون ادبی تراوشیں کے ذیل میں ''شبلی کی جامعیت'' کے عنوان سے شامل کیا ہے جس کے مصنف بھی اقبال سہیلؔ ہی ہیں۔

شبلی نعمانی اُردو تنقید میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں،عظیم مورّخ ،عالم دین ،سیاسی مفکر کے علاوہ ''شعرالعجم '' کے لیے مشہور ہیں ، جو سرسید احمد خاں کے زیر اثر روایت کے محدود وتنگ دائرے سے نکل کر ادب کے وسیع میدان میں داخل ہوئے ،انھوں نے اردو زبان میں اسلامی تاریخ کا ذوق پیدا کیا۔شبلیؔ کا شمار اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کو اپنی دولازوال کتابوں ''شعرالعجم '' اور ''موازنہ انیسؔ ودبیرؔ'' میں جامعیت کے ساتھ کیا ہے۔موازنہ میں شبلیؔ نے فن مرثیہ نگاری کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ساتھ فصاحت بلاغت ،تشبیہ استعارے اور دیگر فنی وسیلوں کی توضیح کی ہے''شعرالعجم ''میں انھوں نے شعر کی حقیقت وماہیئت اور لفظ ومعنی کے رشتے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبال سہیلؔ اپنے مضمون ''شبلی کی جامعیت میں'' لکھتے ہیں:

> جن محاسن تک مولانا کی نکتہ سنج نگاہیں اور جن گوشوں سے مسئلہ ارتقا نے اجسام اور دوسرے متکلمانہ مباحث مولانا نے تلاش کرکے نکالے ہیں ادھر آج تک کسی کا ذہن منتقل نہ ہوسکا تھا۔شاہنامہ فردسی کو جو مقبولیت فارسی لٹریچر میں حاصل ہے،اس کا اعادہ فضول ہے تاہم (ج تک کسی کو یہ توفیق نہیں

ہو سکی تھی کہ اس کے ادبی محاسن کو جاگر کر سکے، تقلیداً اور اتباعاً واہ واہ کہہ دینا اور مولانا کی طرح بلا دلیل غالبؔ کے سہرے پر ذوقؔ کے سہرے کو ترجیح دینا یا ہمارے دوست مولوی عبد السلام ندوی کی طرح اسی ترانۂ کہن کو دہرا دینا دوسری بات ہے اور وجوہ ترجیح کو مدلل پیش کرنا ایک علاحدہ شے ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ مولانا شبلی اس پر اپنی قوت تنقید صرف نہ کی یہی وجہ ہے کہ تنقیدی اعتبار سے شعر العجم کے درجہ کی کتاب اب تک فارسی لٹریچر سے متعلق لکھی نہیں جا سکی، شعر العجم کی تنقیدی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا کا سکتا ہے کہ خود علما ایران کی ایک منتخب جماعت بڑے اہتمام سے شعر العجم کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' (ص۲۰۲)

اقبال سہیلؔ اپنے مضمون ''شبلی کی جامعیت'' میں مزید لکھتے ہیں:

علامہ شبلی کا انداز بیان اس سے مختلف ہے، اس کا قلم رقص کا خوگر ہے اور ان کے نغمات گوش و سر مستی سے معمور، انتہائی غم میں بھی ان پر مایوسی طاری نہیں ہوتی اور کلوفارم بھی ان کے دل و دماغ کو معطل نہیں کر سکتا، ان کی سب سے دردانگیز نظم جنگ بلقان پر ہے مگر اس میں بھی تحریک عمل کا پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔''
(ص۲۰۴)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کتاب کے آخری صفحہ پر پروفیسر مشیر الحق کے آخری خط کا عکس شامل کیا ہے جو انھوں نے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ہی نام لکھا تھا۔ مذکورہ خط کے بارے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ایک اندوہ ناک واقعہ بیان کیا ہے:

پروفیسر مشیر الحق ان دنوں کشمیر یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے

،وہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے، میں نے ان سے اقبال سہیلؔ کی نعت گوئی پر مضمون لکھنے کے لیے کہا وہ مضمون لکھنے کے لیے تیار ہوگئے ،انھوں نے موضوع سے متعلق کچھ کتابیں طلب کیں، میں نے انہیں کتابیں بھی فراہم کرادیں ،دو ماہ گزرنے کے بعد ان کا ایک دستی خط اور دو کتابیں موصول ہوئیں لیکن اقبال سہیلؔ پر ان کا مضمون نہیں ملا چندروز بعد آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے یہ خبر نشر ہوئی کہ پروفیسر مشیر الحق کو کشمیر کے انتہا پسندوں نے شہید کردیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونْ ،اقبال سہیلؔ پر موصوف کا مضمون تو شامل اشاعت نہ ہوسکا غالباً ان کا آخری خط جو خاکسار کے نام ہے،اس کتاب میں شامل کردیا گیا ہے جو ہمیشہ ان کی یادوں کو تازہ کرتا رہے گا۔''(ص۸)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مذکورہ تصنیف اقبال سہیلؔ کی شاعری عظمت کے تعین میں نہ صرف معاون ہے بلکہ موصوف کی زندگی کے حالات وکوائف اور تمام وکمال پہلوں پر پر روشنی ڈالتی ہےاور پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی جانب سے خراج عقیدت بھی ہے۔

❁❁

اُردو کا فاصلاتی نظام تعلیم: تدریس کے آئینہ میں

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مرتبہ کتاب ''اردو کا فاصلاتی نظام تعلیم'' ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اُردو کا فاصلاتی نظام تعلیم ہے۔موصوف نے اِس کتاب میں مختلف ماہر تعلیم کے مضامین کو یکجا کر کے ایک جامع اور معلومات افزا کتاب تیار کی ہے۔کتاب میں شامل تمام مضامین موضوع کی مناسبت سے مختلف عنوانات کے تحت نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ فاصلاتی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اور باذوق قارئین کے لیے بہت سی غیر معمولی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔اِس کتاب کا مقصد طلبہ میں اردو تعلیم کو عام کرنا ہے اور بالخصوص عوام وخواص میں اردو فاصلاتی نظام تعلیم کو روشناس کرانا ہے۔مذکورہ کتاب میں تعارف، مسائل اور امکانات کے تحت اِس نظام کی خصوصیات کو سہل انداز میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔واضح رہے کہ مذکورہ کتاب سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آگ انڈین لنگویجز (حکومت ہند) میسور کے تحت غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں منعقدہ ورکشاپ میں مختلف ماہرین سے مضامین لکھوا کر کتاب کی اشاعت عمل میں لائی گئی ہے۔

''فاصلاتی نظام تعلیم''، علم حاصل کرنے اور دوسروں کو علم کی سوغات عطا کرنے کا ایک ایسا مؤثر وسیلہ ہے جس کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں، ماہر تعلیم اور اِس شعبہ سے منسلک مختلف لوگوں نے اس کی الگ الگ تعریفات کی ہیں، کچھ لوگ اِسے حصول علم، مہارت اور رویوں سے تعبیر کرتے ہیں کچھ باضابطہ اسکولی تعلیم سے جوڑتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ تعلیم مطلوبہ

تبدیلیاں لانے کے لیے لوگوں کے اذہان کو ایک خاص سمت میں تربیت دینا ہے۔

فاصلاتی تعلیم (Distance Education) ایک اصطلاح ہے جو درس و تدریس کے تمام امور کی وضاحت کرتی ہے، جس میں طلبہ اور اساتذہ کو جگہ اور وقت سے الگ کر دیا جاتا ہے اور یہ طلبہ کے لیے تعلیم کی فراہمی کا ایک طریقہ ہے جو کلاس روم کی روایتی ترتیب میں جسمانی طور پر موجود نہیں رہتے۔

ہندوستان میں کئی دہائیوں قبل ماہرین اور تعلیمی پالیسی سازوں کو اعلیٰ تعلیم کی بنیاد پر فاصلاتی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی فاصلاتی نظام تعلیم کے بنیادی تصور سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کا تصور نسبتاً نیا بھی ہے اور کامیاب بھی وقت کی ضرورت کے پیش نظر پلوٹو اور سینٹ پال جیسے مفکر دانشوروں نے اس موضوع پر پہلی بار قلم اٹھایا اور ان کی چند تحریریں ہی فاصلاتی نظام تعلیم کا باعث بن گئیں، اِس ضمن میں ایک تصور یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ مراسلت یعنی خط و کتابت جو دور قدیم سے ترسیل کا طریقہ کار رہی ہے مراسلاتی نظام تعلیم کا ذریعہ بن گئی ایک انگریز مفکر Broje Holmbergنے ایک کتاب Essential Distance Education تصنیف کی تھی اُس نے کتاب کے صفحہ نمبر ۱۸ پر لکھا ہے ''ایک رسالہ بوسٹن گزٹ Boston Gazzette کے نام سے شائع ہوتا تھا، اس رسالے کے ۲۰ / مارچ ۱۷۲۸ء کے شمارے میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک استاد کیلب فلپس Caleb Philips ہفتہ میں چند اسباق ترسیل کیا کریں گے، ۱۸۳۳ء میں اسی طرح کی

بات سوڈین کے اشتہار میں بھی کہی گئی تھی۔'' (ص ۹)

آج کے ترقی یافتہ مشینی دور میں انسان اپنے معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے مستعد ہے وہ ایسے میں اپنی تعلیم کو جاری نہیں رکھ سکتا، لہٰذا فاصلاتی نظام تعلیم کسی بھی انسان کو جو مزید تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند ہے؛ کو مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی ملازمت یا دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو مکمل کر سکے اور اپنی اس کمی کو پورا کر سکے جو وہ ادھوری تعلیم کے باعث اس میں موجود تھی۔ یہی سبب ہے کہ آج اس نظام تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے دنیا کے تقریباً ہر میں اِس نظام کو رائج کر دیا ہے۔ اس حوالے سے گفتگو فرماتے ہوئے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں:

> آہستہ آہستہ فاصلاتی نظام کا تصور جس کے مختلف نام بھی رہے، مثبت ہوتا گیا اور انیسویں صدی میں فاصلاتی طریقۂ کار تعلیم کا باضابطہ آغاز ہوا بیسویں صدی کے نصف آخر تک پہنچتے پہنچتے یوروپ، امریکہ اور ایشیا میں مراسلاتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے میدان میں خوب ترقی ہوئی کم وبیش دنیا کے ہر ملک میں فاصلاتی نظام تعلیم رائج ہوا، ایک اندازے کے مطابق بین الاقوامی سطح پر دوملین سے زیادہ طلبہ فاصلاتی نظام تعلیم سے استفادہ کر رہے ہیں۔ دولت مشترکہ (Common Wealth Countries) میں ۱۶۰ سے زائد تعلیمی ادارے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت قائم ہیں۔ سویت یونین میں سو سے زائد ادارے، اِس نظام تحت تعلیم فراہم رر ہے ہیں۔ ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت پہلی باضاطبہ یونیورسٹی ''ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی'' حیدرآباد میں قائم ہوئی۔ (ص ۱۰)

جدید دور میں فاصلاتی تعلیم کی کیا اہمیت ہے؟ بالخصوص اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں اِس نظام تعلیم نے کیا رول ادا کیا، مزید یہ کہ اِس سے تدریسی سطح پر اُردو کے فروغ میں کس حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی موضوع کی اہمیت اور کتاب کی تیاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

گذشتہ دو تین دہائیوں میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں نے اردو فاصلاتی نظام تعلیم کو عام کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور اردو طلبا کو اکیڈمک سطح پر اِس نظام سے استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔''اردو کا فاصلاتی نظام تعلیم'' کے موضوع پر طلبا کی رہنمائی کے لیے کتاب ترتیب دے کر شائع کی ہے، کو بالترتیب اٹھارہ مضامین پر مشتمل ہے اِن مضامین میں فاصلاتی نظام تعلیم کا تعارف، اہمیت و افادیت مسائل و امکانات مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں مثلاً مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، اگنو، نئی دہلی، جامعہ اردو علی گڑھ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) دہلی یونیورسٹی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولینگ، خواندگی سے فاصلاتی نظام تعلیم تک، دینی مدارس الیکٹرونک میڈیا، یعنی ذرائع ابلاغ، ٹی وی ریڈیو اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو فاصلاتی نظام تعلیم کی تدریس اور فروغ وغیرہ شامل ہیں۔'' (ص ۱۱)

مذکورہ کتاب کی خصوصیات کے ذیل میں پروفیسر نصیر احمد خاں (سینئر صلاح کار اردو اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (نئی دہلی) کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

زیرِ نظر کتاب کے مضامین چار نوعیت کے ہیں، فاصلاتی نظام

تعلیم اور ادارے، فاصلاتی نظام تعلیم اور برقی میڈیا، فاصلاتی نظام تعلیم کی اہمیت اور فاصلاتی نظام تعلیم کا نصاب کتاب میں شامل مضامین معلوماتی نوعیت کے ہیں اور اپنی جگہ مکمل ہیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک نئے موضوع پر دانشوروں سے مضامین لکھوائے اردو میں شاید یہ پہلی کتاب ہے جو فاصلاتی نظام تعلیم سے متعلق بعض اہم نکات کا احاطہ کرتی ہے۔ پروفیسر صدیقی کی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کے لوگ قائل ہیں اور اردو دنیا کا بڑا حصہ اس کا معترف ہے اس کتاب کی ضرور پذیرائی ہوگی۔''(ص۱۵)

مجموعی طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ فاصلاتی نظام تعلیم اپنے اندر کشادگی اور وسعت پیدا کر چکا ہے نیز روز بروز اس میں اضافہ بھی واقع ہو رہا ہے اور یہ وقت و حالات کی اشد ضرورت بن چکا ہے۔ مستقبل میں اس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کی اہلیت صرف اسی نظام تعلیم میں موجود ہے، کیونکہ لوگ اپنی معاشی مجبوریوں اور وسائل کے فقدان کے سبب اپنے تعلیمی سلسلے کو با قاعدہ جاری نہیں رکھ سکتے، بالخصوص دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین جو سماجی و معاشرتی رسم و رواج اور پردے کی پابندی کے پیش نظر گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں، وہ خاص طور سے اِس ذریعہ تعلیم کی بدولت اپنی سوچ اور خیالات و شعور کو وسعت دے سکتی ہیں۔ اس تعلیمی نظام کو کووڈ ۱۹ (Covid-19) نے وقت کی اہم ضرورت کے طور پر ثابت کیا، جس کے بغیر کوئی بھی نظام ممکن نہیں تھا۔

اِس ذریعہ تعلیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھ سکتا ہے اور انسان تعلیم کی بدولت ترقی کی منازل بھی طے کرتا چلا جاتا ہے لیکن اِس سے قبل فاصلاتی نظام تعلیم اور بالخصوص اُردو کا فاصلاتی نظام تعلیم سے خواہش مند طلبہ کا مکمل طور پر واقف

ہونا نہایت ضروری ہے جس کے لیے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ترتیب شدہ کتاب ''اردو کا فاصلاتی نظام تعلیم'' بہترین رہنما ہے۔

❁❁

جدید اُردو ریڈر: اُردو رسم الخط کی تدریس

بچّوں کی تعلیم کا ایک دائرہ وہ ہے جو انہیں اپنے خاندان سے حاصل ہوتا ہے، اس تربیت کا اہم ترین پہلو بچوں (اولاد) کے ساتھ والدین بالخصوص ماں باپ کا طرزِ عمل خاصا اہم ہے لیکن اِس کے علاوہ بھی کچھ مؤثر ذرائع بھی موجود ہیں جن کی وساطت سے ابتدائی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر بچّہ منفرد ہوتا ہے اور ہر بچّے کے اندر صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے ہر بچّے کے لیے تعلیم کے کچھ طریقے، دیگر طریقوں کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتے ہیں، اِنہیں میں ایک طریقہ مختلف چیزوں کی تصاویر، بچو کی کہانیاں اور بچوں کی نظمیں یا قومی ترانے ہیں جو بچوں کی نشو ونما اور ابتدائی تعلیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اِس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تصنیف ''جدید اردو ریڈر'' بچّوں کے لیے ایک شاہکار تحفہ ہے، جو اُردو رسم الخط (Urdu Script) کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی ایک جامع کتاب ہے جس میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے پہلی بار حروف تہجی کے مطابق اُردو کے چھتیس حروف کو نشان زد کیا ہے اور اردو رسم الخط کو نہایت ہی دلچسپ اور تکنیکی انداز میں سکھانے کے عمدہ طریقے بتائے ہیں۔ مذکورہ کتاب کی اہمیت و افادیت کے ذیل میں چھتیس گڑھ اُردو اکادمی کے سکریٹری امتیاز احمد انصاری لکھتے ہیں:

> منصبی ذمہ داریوں کے علاوہ موصوف (پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی) ہر سال ملک گیر سطح پر نیشنل سیمینار، ورک شاپ اور

اردو اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام منعقد کرتے ہیں، اگرچہ تحقیق و تنقید ان کا خاص میدان ہیں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں ان کی کتابیں شامل ہیں لیکن اسکولی سطح کے طلبا کے لیے بھی ڈاکٹر صدیقی نے چند معیاری نصابی کتابیں تیار کی ہیں جو مختلف سطحوں پر اسکولوں میں شامل ہیں زیر نظر ''جدید اُردو ریڈر'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اردو رسم الخط کی تدریس کے نقطۂ نظر سے اپنی نوعیت کی یہ ایک منفرد کتاب ہے اِس کتاب میں ڈاکٹر صدیقی نے پہلی بار کلی طور پر حروف تہجی کے تحت اردو کے چھتیس حروف کی نشاندہی کی ہے اور اردو رسم الخط کو نہایت ہی دلچسپ اور تکنیکی انداز میں سکھانے کے جدید طریقے بتائے ہیں۔ امید ہے کہ طلبا اور اردو زبان سیکھنے میں دلچسپی رکھنے والے افراد، اِس کتاب سے یقیناً مستفید ہوں گے۔'' (ص۵تا۶)

موصوف نے اردو حروف تہجی کے حوالے سے مختلف اردو کے ابتدائی قاعدوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد اردو میں ۳۶ حروف تہجی بتائے ہیں۔ ان حروف میں '' آ ء ں ھ'' کو حروف تہجی میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہکاری آوازیں یعنی Aspirated sounds کی تعداد ۱۵ بتائی ہے۔ اس طرح اردو میں کل آوازوں کی تعداد ۵۱ قرار دی ہے حروف کی بدلتی شکلیں Allographic shapes ہم صورت آوازیں Similar sounds، ہم شکل حروف Similar shapes کے علاوہ Connector اور Broken, Unrbroken - Non Connector حروف کو آسان طریقے سے سمجھایا ہے۔ اعراب کی تدریس کے طریقہ کار علم ہجا یعنی Orthography اور علم حرف وغیرہ کو مشقوں (Exercises) کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔

مادری زبان سے مراد ماں کی زبان ہے یعنی یہ وہ زبان ہے جس میں ایک ماں اپنے بچے کو لوری دیتی ہے اور اُسے بولنا سکھاتی ہے، اگر چہ بچے کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جائے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ زبان سیکھ جاتا ہے اور باتیں بھی آسانی سے، اُس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔اس لیے ماہر تعلیم اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم مادری زبان ہی میں ہونی چاہیئے تا کہ بچہ بآسانی علم سیکھ سکے اور ساتھ ہی ساتھ دیگر زبانوں سے بھی واقف ہو سکے۔اِس ضمن میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ماہر تعلیم کا خیال ہے کہ ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیئے تا کہ ایک طرف ان کی سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل ہو سکے اور دوسری طرف وہ جدید علوم سے بھی روشناس ہوں اردو میں اس کی نوع کی کتابوں کی کمیابی کا احساس ایک عرصے سے تھا۔اسی احساس کے پیش نظر ابتدائی سطح کے طلبا کے لیے یہ کتاب اردو زبان میں تیار کی گئی ہے جو دراصل ایک ابتدائی کوشش ہے۔''(ص ۸)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی ذہنی نشو ونما میں مادری زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا،ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زبان اردو جس کے الفاظ شیریں اور اس کی خاصیت ہر فرد کو گرویدہ کرنے کی ہے؛ کو اپناتے ہوئے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلائیں،جس کے لیے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی کتاب ''جدید اُردو ریڈر'' بہت کارگر ہے۔

❋❋

آسان اُردو گرامر: اُردو قواعد کی تدریس

اُردو زبان کو صحیح طور پر بولنے، لکھنے، سمجھنے، سمجھانے اور درس و تدریس کے لیے ایسے اصولوں کی ضرورت ہے جس کے وسیلے سے اردو زبان کی صحت اور اس کی ادبی و لسانی خوبیوں اور اس کے محاسن سے پوری آگاہی ہو سکے، اِنہیں اصولوں کا نام گرامر (Grammar) یا قواعد ہے، یعنی قواعد اس علم کو کہتے ہیں جس سے اردو زبان کا صحیح طور پر بولنا، لکھنا آجائے اور طلبہ انشا کا فن سیکھا جائیں، اردو قواعد پانچ حصوں میں منقسم ہے۔

علم ہجایا (Orthography)

علم صرف (Etymology)

علم نحو (Syntax)

علم بلاغت (Eloquence)

علم عروض (Prosody)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مذکورہ بالا کتاب ''آسان اُردو گرامر'' ہماچل پردیش کے اُردو اساتذہ کی فرمائش اور بار ہا تقاضوں کے بعد تیار کی تھی کیونکہ ایک عرصۂ دراز سے ہماچل پردیش کے اسکولوں میں اِس نوعیت کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ موصوف نے اِسی خلا کو پر کرنے کی غرض سے یہ کتاب تیاری کی تھی جو طلبہ کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔

حالانکہ اردو گرامر یا قواعد سے متعلق بہت سی کتب مل جاتی ہیں لیکن مذکورہ بالا کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اِس کتاب میں مختلف تحریری نمونوں اور جمع / واحد کے ساتھ ساتھ علم ہجا کے تحت اسم، ضمیر، صفت اور فعل وغیرہ کو ہندی رسم الخط میں بھی لکھا گیا ہے تاکہ طلبہ کو صحیح تلفظ معلوم ہو سکے۔

علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے سابقے / لاحقے اور القاب و آداب کے علاوہ اردو تحریروں میں مستعمل مختلف علامتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے طلبہ کی سہولت کے لیے 'مہمل' اور 'ہم صوت' الفاظ کے ساتھ 'تشبیہ' 'استعارہ' 'تشدید' اور 'اسم معرفہ و نکرہ' کو بھی فصیح انداز میں سمجھانے کے ساتھ 'متروک' الفاظ بھی لکھ کر بتائیں ہیں اور 'عرف' خطاب' لقب' کنیت' تخلص کا فرق بھی بیان کیا ہے نیز چند اُردو محاورے لکھ کر ان کا استعمال بھی سکھایا ہے ،اس کے علاوہ 'فعل' (Verb) 'فاعل' (Subject) اور مفعول (Object) کی تعریفات بھی آسان زبان میں سمجھائی ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مذکورہ بالا تصنیف ابتدائی کلاسوں میں زیر تعلیم طلبہ یا وہ عام لوگ جو اردو زبان کو عمومی طور پر جانتے یا سمجھتے ہیں؛ کے لیے حد درجہ مفید ہے۔

❁❁

اُردو ہندی ڈکشنری: لغت نویسی کا فن

کسی لغت کی ابتدائی شکل، اس زبان کے بولنے والوں کے ذہنو میں یادداشت کے طور پر ہوتی ہے، اس میں روزمرہ کے محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں اور ذخیرہ الفاظ شامل ہوتے ہیں اور یہی وہ سرمایہ ہوتا ہے جسے معنی ومفہوم کے ساتھ ڈکشنری کی صورت میں محفوظ کرلیا جاتا ہے۔

اوالذکر یہ کہ کوئی بھی زبان سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے لسانی سرمائے کو اپنے اندر محفوظ کرنے کی پوری قوت وصلاحیت رکھتی ہے نیز اس کی حفاظت کرتی ہے، غلط استعمال کو روکتی ہے اور غلط گوئی سے ٹوکتی ہے، خود نئے نئے الفاظ ڈھال کر دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کرکے، اپنے سرمایہ الفاظ میں اضافہ بھی کرتی چلی جاتی ہے اور یہ کام لغت نویسی کا ہے جس کے ذریعے زبان کا ارتقا جاری رہتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی بحیثیت ماہر تعلیم، دانشور اور اپنے دیگر علمی وادبی خدمات کے لیے مشہور ومعروف ہیں۔ موصوف نے لغت نویسی کا مشکل ترین کام بھی بڑی مہارت سے سرانجام دیا ہے۔ ''اُردو ہندی ڈکشنری'' سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل (حکومت ہند) کے تحت ذیلی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے والے ثانوی زبان کے طلبہ اور اساتذہ کو ذہن میں رکھ کر تیار کی ہے، لیکن اِس اردو ہندی ڈکشنری سے ہر عام وخاص اور بہ ذوق قارئین بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔

یوں تو کتب خانوں اور مختلف بک اسٹالوں پر بہت سی ڈکشنریاں دستیاب ہیں اور اہم بھی ہیں۔ اُردو ہندی ڈکشنری کئی اعتبار سے اہم ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِس کی تیاری میں کئی اہم تجربات کیے ہیں۔ موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ابتدا میں یہ مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ تھا کہ اردو کی اُن آوازوں کو جو ہندی میں موجود نہیں ہیں، کیسے اور کس طرح ادا کیا جائے مثلاً 'ق' کے لیے क़ خ کے لیے ख़ ظ کے لیے ज़ وغیرہ اِس ضمن میں اصل حروف کے نیچے ایک نقطہ لگا کر آواز واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ڈکشنری تیار کرنے کے ہر مرحلے میں ثانوی زبان کے طور پر اُردو سیکھنے والے طلبہ کو ذہن میں رکھا گیا ہے، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ ہندی زبان سے بخوبی واقف ہیں۔ (پیش لفظ)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لغت نویسی کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈکشنری کے ابتدائی صفحات پر سہولت کے لیے مختلف الفاظ یعنی Abbreviations کی فہرست بھی دی ہے۔ الفاظ کا اندراج اُردو میں کیا ہے پھر لفظ اردو میں لکھ کر زبان کا ماخذ دیونا گری میں درج کیا ہے مثلاً:

عربی زبان کے لیے अ
فارسی کے لیے फ
ترکی کے لیے तु

اِس کے ساتھ ہی تذکیروتانیث یا صفت کے لیے पु, स्त्री, वि لکھ دیا گیا ہے اور اس کے سامنے دیونا گری میں اصل لفظ بھی درج ہے۔ اس کے بعد ناگری میں لفظ کے معنی نہایت آسان زبان میں لکھے گئے ہیں یا ان کے متبادل درج کر دیے گئے ہیں جو عام طور پر ہندی زبان کے جاننے والے طلبہ بآسانی سمجھ سکیں۔ محاورے، کہاوتیں اور ضرب المثل کسی بھی زبان کا حسن

ہوتے ہیں، اِن کے بغیر کوئی بھی تحریر خوبصورت نہیں بنائی جا سکتی یا اُس تحریر کا لکھنے والا زبان سے ناواقف قرار دیا جائے گا۔ پروفیسر صدیقی نے مذکورہ بالا ڈکشنری میں اردو میں مستعمل بعض کہاوتیں اور محاورے بھی شامل کیے ہیں۔ لہٰذا یہ ڈکشنری بالخصوص ایسے طلبہ کے لیے کارگر ہے جو ثانوی زبان کے طور پر اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔

❁❁

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اور ترجمہ نگاری

ترجمہ کا فن یا اس کی تعریف کن لفظوں میں ممکن ہے؟ یہ یقیناً ایک اہم، سنجیدہ اور دلچسپ سوال ہے۔ اس کی اہمیت بھی بنیادی حیثیت کی ہے لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا غیر معمولی سوال ہے کہ اس کا جواب چند سطور میں دے کر کسی کی علمی تشفی ممکن نہیں۔

واضح رہے کہ فن ترجمہ نگاری کسی دوسرے تخلیقی کام سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ عمل ہے کیونکہ کسی خیال کو تخلیق کا جامہ پہنانے والا شاید اتنا زیادہ نہیں سوچتا، جتنا کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں اس تخلیق کو منتقل کرنے والے یعنی ترجمہ نگار کو درکار ہوتا ہے۔ تخلیق جبری اور فطری دونوں طرح کے تقاضوں کا ثمرہ ہوتی ہے۔ فن ترجمہ کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں لکھتے ہیں:

> ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے، اس میں مترجم، مصنف کی شخصیت فکر و اسلوب سے بندھا ہوتا ہے، ایک طرف اُس زبان کا کلچر جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہو، اُسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اُس زبان کا کلچر جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے

یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ دیتی ہے۔"

(ارسطو سے ایلیٹ تک، ڈاکٹر جمیل جالبی" ص ۳۷)

معروف فکشن رائٹر ڈاکٹر رشید امجد نے ترجمہ نگاری کو ایک ایسا دریچہ قرار دیا ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ترجمہ نگاری اِتنا مشکل اور پیچیدہ کام ہے تو پھر اس کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ درحقیقت ترجمہ نگاری انسان کی تہذیبی، سماجی معاشرتی، ثقافتی، لسانی، فکری اور مذہبی ترقی وضرورت کا نام ہے۔ ادبی تخلیقات کا دیگر زبانوں میں ترجمہ بڑی اہمیت کی حامل ہے، اِس سے لوگ ایک دوسرے کے عقائد مذاہب رسم ورواج، تہذیب وتمدن سے واقف ہوجاتے ہیں بلکہ کسی بھی سماج اور معاشرے کی سمت ورفتار کا بھی علم ہوجاتا ہے، گو کہ ترجمہ کرتے ہوئے کسی زبان کی اپنی خصوصیات، لطافت، چاشنی کو قائم رکھنا ایک دشوار گزار مرحلہ ہے لیکن یہ وہ وصف ہے جس سے قومی یکجہتی یا بین الاقوامی یکجہتی کو بے حد فروغ ملتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا شمار ماہر تعلیم کے علاوہ اُردو کے ممتاز دانشوروں، ناقدین اور محققین میں کیا جاتا ہے وہیں موصوف نے اپنی پہچان ایک کامیاب مترجم کے بھی مستحکم کی ہے اِس سلسلے میں انھوں نے کئی ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

دُون کا سبزہ

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی یہ کتاب انگریزی کے مشہور ادیب رسکن بونڈ کی کہانیوں کا مجموعہ Our Tress Still Grow in Dehra کا اردو ترجمہ ہے۔ مجموعہ میں شامل سبھی سولہ کہانیوں کا موصوف نے براہ راست انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، جسے ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب میں شامل بیشتر کہانیاں رسکن بونڈ نے مسوری میں ہی لکھی ہیں۔

جنم دن

مختلف زبانوں کے سات افسانوں پر مشتمل ایک دلچسپ کتاب ہے جو ادب کے قاری کے لیے بہت اہم ہے بلکہ اس میں شامل سبھی کہانیاں ہندوستانی تہذیب وتمدن اور ثقافتی اقدار کی

آئینہ دار ہیں ۔''جنم دن'' میں شروع کی تین کہانیاں ''پھولوں کا مول، بھداری'' اور ''جنم دن''، جنہیں پروفیسر صدیقی نے ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے تحت منعقدہ ترجمہ ورک شاپ میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ''عصری ہندوستانی کہانیاں'' کی جلد اوّل اور جلد دوم میں سلسلہ وار شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ باقی پانچ کہانیاں ''مرگ شجر، کبڑا بھکاری، اچھوت، خواہش'' اور ''جنون'' جو انگریزی کے معروف فکشن رائٹر رسکن بونڈ کی کہانیاں (Our Tress Still Grow in Dehra) ہیں جنہیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے تحت براہ راست انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ بعد ازاں اِس بصورت کتاب کو ساہتیہ اکادمی نے ہی شائع کیا اور خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ کہانی ''جنم دن'' این سی ای آر ٹی (NCERT) نئی دہلی نے بارہویں جماعت کی درسی کتاب ''خیابان اردو'' میں بھی شامل کی ہے۔

ہیون سانگ کا سفر ہندوستان

''ہیون سانگ'' ایک چینی سیاح تھا، جس نے بدھ مذہب کی تعلیمات کی تلاش میں ہندوستان کا سفر کیا، اِس سفر نامہ کا مصنف ہیون سانگ خود ہے، جس کا اردو ترجمہ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کیا ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا سفر نامہ میں ہیون سانگ اپنے سفر کے تمام احوال وکوائف تحریر کیے ہیں، جنہیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے بڑی مہارت سے ترجمہ کیا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ترجمہ نگاری اور فنکارانہ صلاحیتوں کے حوالے سے پروفیسر ابن کنول (یونیورسٹی آف دہلی) لکھتے ہیں:

> افسانوی ادب کا ترجمہ علمی کتابوں کے مقابلے میں مشکل عمل ہے لیکن پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اِسے بخوبی نبھایا ہے اس لیے وہ ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی ذہن بھی رکھتے ہیں ۔ان کے ترجمے میں ترجمے کا احساس نہیں ہوتا۔ اِس مجموعہ (جنم دن) میں ملیالم ،آسامی ،بنگالی اور انگریزی

کہانیاں شامل ہیں، سبھی افسانے اپنی زبانوں کے مشہور
افسانے ہیں۔ان افسانوں کو پڑھ کر مذکورہ زبانوں میں افسانہ
کی سمت و رفتار کا بھی علم ہوتا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی
اس سے قبل بھی ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے کئی
اہم کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ان کی زبان میں سادگی
سلاست اور نفاست ہے۔ان کی زبان و بیان میں ابہام نہیں
ترجمہ شدہ کہانیوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اردو ہی
میں لکھی گئی کہانیاں ہیں۔''

بنگالی کہانیاں

ادب کسی خاص قوم کی میراث نہیں ہوتا، ہر زبان میں تخلیقی مظاہر منظر عام پر آتے ہیں اور ترجمہ ہی کی وساطت سے انہیں دوسری قوموں تک پہنچانا ممکن ہوتا ہے۔جب کسی افسانہ یا ناول کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو مترجم صرف لفظی منتقلی نہیں کرتا بلکہ ایک تہذیبی ،سماجی وثقافتی اور تمدنی معنویت کو دوسری تہذیبوں، سماج و معاشروں میں متعارف کراتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی مذکورہ بالا تصنیف ''بنگالی کہانیاں'' تین سو اٹھاون صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔اِس میں شامل سبھی انتیس کہانیاں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے بنگلہ زبان سے اردو میں ترجمہ کروا کر ترتیب دیا ہے۔کتاب میں ابتدائی دو کہانیاں رابندر ناتھ ٹیگور کی ''مہمان'' اور کابلی والا'' شامل کی ہیں۔ایک کہانی ''پھولوں کا مول'' بھی شامل ہے جسے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے براہ راست انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔

کتاب میں شامل سبھی کہانیاں ادبی ذوق کے حامل قارئین کے لیے نہ صرف دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں بلکہ ایک نئے ماحول کے پس منظر سے روشناس کرانے کا وسیلہ بھی ہیں اور لسانی وتہذیبی ہم آہنگی کی عمدہ مثال بھی پیش کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی نے اپنی کتاب اردو ادب کی تاریخ کو ہندی

زبان میں ترجمہ کر کے ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔

''تحریک آزادی اور اردو نثر'' پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ایک اہم تصنیف ہے، اپنی اس تصنیف کو موصوف نے "Freedom Movement and Urdu Prose" کے نام سے انگریزی زبان میں نہایت کامیاب اور معیاری ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب وکاس پرکاشن (کانپور) نے ۲۰۰۴ء میں شائع کی تھی۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے گورنر ہماچل پردیش کے اردو مترجم یعنی Urdu Interpreter کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

❁❁

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی تصانیف و تالیف

۱ اردو ادب کی تاریخ
۲ تحریک آزادی اور اردو نثر
۳ اسالیب فکر
۴ معروضات
۵ شہیدان جنگ آزادی
۶ جوشؔ کی تیرہ نظمیں
۷ تحریک آزادی اور اردو صحافت
۸ اقبال سہیلؔ کا فن
۹ فاصلاتی نظام تعلیم
۱۰ آسان اردو گرامر
۱۱ جدید اردو ریڈر
۱۲ اردو ہندی ڈکشنری
۱۳ بنگالی کہانیاں (ترجمہ)
۱۴ دون کا سبزہ (رسکن بونڈ کی انگریزی کہانیوں کا اردو ترجمہ)
۱۵ ہیونگ سانگ کا سفر ہندوستان (ترجمہ)
۱۶ جنم دن (ترجمہ)
۱۷ شہباز امروہوی: فن اور شخصیت
۱۸ Freedom Movement and Urdu Prose (Under Print)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی زیرِ طبع کتابیں

۱ دہلی کے اُردو ادارے
۲ فکر و تحقیق (تحقیقی مضامین و مقالات)
۳ احسان دانش: انتخاب کلام
۴ اردو ادب کی تاریخ (ہندی ترجمہ)

ڈاکٹر ارشد اقبال کی تصانیف

۱ اردو مختصر افسانے میں سماجی وثقافتی عناصر (تحقیق)
۲ نیا تنقیدی شعور (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
۳ دیارِ غیر میں اردو افسانہ (تحقیق وترتیب)
۴ چھتیں (افسانوں کا مجموعہ)
۵ ننھے پائلٹ (بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ)